طلوعِ اسلام

اگست
سنہ ۱۹۵۴ء

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک	مُرتّب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ	سعید احمد	دس آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)

جلد ۷	اگست ۱۹۵۴ء	نمبر ۸

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
لمعات	۵ - ۱۶
طلوعِ اسلام نے آج تک	۱۷
کراچی کی ایک شام	۱۹ - ۳۰
یتیم پوتے کی بحثیں دیکھکر (ابنِ آدم)	۳۱ - ۳۷
غذا اور سائنس (جناب محمد احسن جلیل صاحب ایم۔ اے)	۳۸ - ۴۵
نقد و نظر	۴۶ - ۵۰
۱- ہمارے اسمٰعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام۔	
۲- حدیث دفاع	
۳- ISLAMIC SOCIAL FRAMEWORK	
۴- خضرِ راہ	
۵- اندلسی حکومت	
باب المراسلات	۵۱ - ۵۴
۱ ذوالقرنین	
اختلاف امتی رحمۃ (علامہ تمنا عمادی)	۵۵ - ۶۶
رفتارِ عالم	۶۷ - [illegible]
مولوی، صوفی اور حدیث	۷۲ - [illegible]

معارف القرآن

کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان میں سے پہلی تین جلدیں مدت سے نایاب ہیں۔ قرآنی ذوق رکھنے والوں کے پیہم تقاضوں کے پیش نظر جناب پرویز نے ان جلدوں پر نظر ثانی کی ہے اور (علاوہ دوسری تبدیلیوں کے) ان کی ترتیب کو بھی بدل دیا ہے۔ چنانچہ

معارف القرآن جلد دوم

اب اس سلسلہ کی پہلی کڑی قرار دی گئی ہے اور اس کا نام رکھا گیا ہے۔

ابلیس و آدم

اس میں انسانی تخلیق (نظریۂ ارتقاء)۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی اور رسالت سے متعلق مباحث شامل ہیں۔

ایسے اہم عنوانات۔ قرآن کی تعلیم۔ اور جناب پرویز کا قلم

آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ کتاب کیا ہو گی!

یہ کتاب بڑی تقطیع (۲۲×۲۹/۸) کے ۴۰۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب پریس میں ہے تاریخ اشاعت کا بعد میں اعلان کیا جائیگا اور جس ترتیب کی فرمائشیں آئینگی اسی ترتیب سے اسکی روانگی ہوگی۔ لہذا اپنی فرمائش بہت جلد بھیجئے

جن حضرات کا روپیہ ہمارے پاس جمع ہے ان میں سے وہی اطلاع دیں جنہیں یہ کتاب درکار نہ ہو۔ باقی سب کو یہ کتاب از خود بھیجدی جائیگی

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یہ واقعہ ہے کہ پاکستان، ہندوؤں کی شدید ترین مخالفت کے علی الرغم وجود میں آیا تھا۔ ان کی مخالفت کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ اس سے ان کی مملکت کا رقبہ کم ہو جاتا تھا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس سے ان کا وہ خواب پریشاں ہو جاتا تھا، جس میں وہ دیکھتے تھے کہ وہ کس طرح اپنی صدیوں کی غلامی کا انتقام مسلمانوں سے لیتے ہیں۔ ان کے ذہن میں آزادی کا مفہوم صرف اتنا ہی نہ تھا کہ وہ انگریزوں کو ملک بدر کر دیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنا محکوم اور غلام بنائیں اور ان کا خون چوس کر اپنی ہوسناکیوں اور تشنہ کامیوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچائیں۔ لہٰذا پاکستان کا وجود میں آجانا ان کے لئے نہ صرف شکستِ پندار کا باعث تھا بلکہ ان کی ہوس اقتدار کی عدم تسکین کا موجب بھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی تنگ نظر قوم کو اس طرح شکست مل جائے اور اس کی مفاد پرستیوں کی روپہلی دنیاؤں اُجڑ جائے تو وہ قوم کس طرح سانپ کی طرح بل کھایا کرتی ہے۔ یہ سات سال کا عرصہ درحقیقت ہندوؤں کے اس قلبی اضطراب اور اس سے پیدا شدہ بل اور پیچ کی رہرآلود داستان ہے۔ وہ کونسا حربہ ہے جو انھوں نے پاکستان کی تخریب کے لئے استعمال نہیں کیا۔ اور وہ کونسا قدم ہے جو انھوں نے اس نوزائیدہ مملکت کی تباہی کے لئے نہیں اٹھایا۔ انہی انسانیت سوز حربوں میں سے ایک وہ تھا جو سات سال سے مسلسل آتشِ خاموش کی طرح سلگایا جا رہا تھا اور جو بالآخر ۸ رجولائی کو بھاکڑہ بند کی شکل میں اس طرح شعلہ انگیز ہوا کہ پاکستان کے لاکھوں مرفہ الحال کاشتکار اس کی لپیٹ میں آگئے۔ اور بے شمار سرسبز و شاداب رقبہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ پوری ہندو جاتی نے اپنے اس کارنامہ پر مسلسل جشن مسرت منایا۔ جس قوم کے دیوی دیوتا جیتے جاگتے انسانوں کو اپنے رتھ کے پہیوں کے نیچے کچل کر خوش، ان کے خون کی ہولی سے "پرسن" اور ان کے سوختنی گوشت کی خوشبو سے مست ہوتے ہوں اس قوم کے نیتا اپنی ہمسایہ قوم کا پانی بند کر کے گھی کے چراغ کیوں نہ جلائیں اور فتح کے شادیانے کیوں نہ بجائیں۔ آپ نے پڑھا (اور سینما میں دیکھا) ہوگا کہ جب افریقہ کے وحشی کسی انسان کو پکڑ کر زندہ جلاتے ہیں تو اس کے گرد ناچتے اور گاتے، ڈھول پیٹتے اور سرمستیاں کرتے ہیں۔ اس موقع پر ان کی خوشی اپنی انتہا پر ہوتی ہے۔ ہندو قوم ذہنی تربیت کے اعتبار سے زمانۂ قبل از تہذیب میں بستی ہے اس لئے وہ انسانوں کو ستا کر بہت خوش ہوتی ہے۔

ستلج کی نہروں کے پانی کا بند ہوجانا کوئی ایسا حادثہ نہیں جس کے اثرات ایک آدھ دن کے بعد مدھم پڑجائیں اور دوچار روز کے بعد ختم ہوجائیں۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس کے نتائج بڑے دوررس اور جس کے عواقب مستقل نقصانات کے حامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا حادثۂ عظیمہ بڑی گہری فکر کا محتاج اور وسیع تدبیری اقدامات کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس قسم کے اہم اجتماعی مسئلہ کے مختلف گوشے اور متنوع زاویے ہوتے ہیں جن سے اس پر غور کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک نمایاں گوشہ تو یہ ہے کہ اس کے متعلق مملکت کے اربابِ نظم ونسق کیا سوچتے اور کیا کرتے ہیں، لیکن اس وقت اس مسئلہ کا جو پہلو ہمارے سامنے ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ایسے شدید، اہم اور گہرے ملی حادثہ کا ردِّعمل قوم کی طرف سے کیا ہوا، اور ایسا کیوں ہوا؟ ہمارے نزدیک قومی زندگی میں یہی وہ مقامات ہوتے ہیں جہاں سے قوم کے مزاج، جذبات رجحانات، اجتماعی مسائل سے دلچسپی اور ان کے حل کے لئے قوتِ عمل کا صحیح صحیح اندازہ ہوجاتا ہے اور سطح سے نیچے اتر کر دیکھنے والی آنکھیں دیکھ لیتی ہیں کہ مملکت کے مفاد اور ملت کے مستقبل کے متعلق اس قوم سے کیا کیا توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

جہاں تک اس واقعہ کے تباہ کن نتائج کا تعلق ہے، یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ قوم کے نچلے طبقہ تک کو بھی اس کا پورا پورا احساس ہے۔ جب ہندوستان کی طرف سے اس کا اعلان ہوا ہے تو آپ کو شاید ہی کوئی آدمی ایسا ملا ہو جس کی زبان پر اس کا ذکر اور جس کے لبوں پہ یہ سوال نہ ہو کہ اب کیا ہوگا؟ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ نہ یہ سوال ہی لبوں سے کچھ آگے بڑھ سکا اور نہ ہی اس کا چرچا دوچار روز سے زیادہ دیر تک رہا۔ اس کے بعد لوگ پھر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے اور دوسری باتوں میں مشغول ہوگئے چنانچہ اب اس طبقہ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو کہ جسے کسی وقت بھی یہ خیال آتا ہو کہ یہ کتنی بڑی مصیبت ہے جو پاکستان کے سر پہ ٹوٹ پڑی ہے۔ ہم نے اس قوم کو سمرنا کے یتیموں اور اَدرنا کی بیواؤں کی مصیبتوں پر مہینوں آنسو بہاتے اور تہجد کے وقت اٹھ اٹھ کر اپنے خدا سے رو رو کر دعائیں مانگتے اور "غازی مصطفےٰ کمال پاشا" کی خیر مناتے دیکھا ہے ہم نے اسے کانپور کی مسجد کے غسل خانہ کے انہدام پر آغشتۂ خاک وخون ہوتے اور بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنتے بھی دیکھا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ان کے قافلوں پر قافلے کس طرح اپنا سب کچھ لٹا کر، گھر بار اور عزیز واقارب کو چھوڑ کر (بزعمِ خویش) خدا کے راستہ پر ہندوستان سے ہجرت کرکے کسی نامعلوم منزل کی طرف چلے جارہے تھے اور پیچھے سے پکارنے والوں کو پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ ہم نے اسے مسجدِ شہید گنج کی بوسیدہ اینٹوں کی خاطر اس کی شکستہ دیواروں کے سامنے گولیوں اور سنگینوں کا نشانہ بنتے بھی دیکھا ہے۔ ان جذباتی شعلہ فشانیوں کے بعد ہم نے اس قوم کو آٹھ نوسال تک مسلسل حصولِ پاکستان کے لئے خاموش جنگ میں مصروفِ

تگ و تاز بھی دیکھا ہے۔ پھر ہم نے اسے تقسیم ہند کے وقت خون کے دریاؤں کے پار اور آگ کی خندقوں کو عبور کر کے ہزار مشکل گرتے پڑتے سرزمین پاکستان تک پہنچکر سڑکوں کے کنارے، درختوں کے نیچے، نہایت خنداں پیشانی سے جان دیتے بھی دیکھا ہے۔ پھر اس کے بعد ہم نے اسے اپنے اپنے محلوں کے پُر فضا نشیمن کو چھوڑ کر مہاجروں کی مٹی کی جھگیوں اور خس و خاشاک کی جھونپڑیوں میں زمین پر سوتے اور رات رات بھر بارش کو اپنے سر پر برساتے بھی دیکھا ہے۔ غرضیکہ ہم نے اس قوم کو مسلسل پچاس سال سے مصیبتوں پر مصیبتیں اٹھاتے اور تکلیفوں پر تکلیفیں برداشت کرتے دیکھا ہے لیکن اسے اس طرح بے حس ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا جیسا کہ اب دیکھا ہے۔

ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس قسم کی حرکت مجسم قوم میں یہ موت کا سا سکون کیوں پیدا ہو گیا۔ یہ شعلۂ جوالہ دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر بن کر کیوں رہ گیا؟ یہ کیا ہوا کہ اس نے خود اپنے آپ پر اس قسم کے عظیم اور ہولناک حادثہ کو آتے دیکھا ہے اور اس سے نہ اس میں کوئی حرکت پیدا ہوئی ہے نہ اضطراب۔ نہ کوئی چیخ نکلی ہے نہ کوئی پکار۔ نہ کوئی تڑپ پیدا ہوئی ہے نہ خلش۔ نہ اپنی جان دینے کا ولولہ پیدا ہوا ہے نہ دشمن کا گلا گھونٹ دینے کا جذبہ۔ بادی النظر میں یہ تبدیلی شاید کچھ زیادہ معنی خیز نہ دکھائی دے لیکن جن لوگوں کی نگاہیں قوموں کی نفسیات کا مطالعہ ذرا گہرائی میں جا کر کرتی ہیں ان کے لئے اس تبدیلی میں عبرت و موعظت کے ہزار سامان موجود ہیں وہ جانتے ہیں کہ قومیں اپنے مال و دولت کے لٹنے اور تخت و تاج کے چھننے سے نہیں مٹا کرتیں۔ وہ مٹا کرتی ہیں اس وقت جب وہ اپنے آپ کو قومی مصائب اور ملی نوائب سے اس طرح غیر متاثر اور غیر متعلق محسوس کرنے لگ جائیں کہ یہ کسی اور کی مصیبت ہے۔ وہ مٹا کرتی ہیں اس وقت جب قوم کے سر پر آنے والی مصیبت، نہ ان پر راتوں کی نیند حرام کرے نہ دن کا چین۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، رونے کا مقام وہ نہیں ہوتا جب متاعِ کاروان لُٹ جائے بلکہ وہ مقام ہوتا ہے جب کاروان کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہے۔ اس حادثہ نے یہ بتا دیا ہے کہ اب ہماری قوم کے دل سے احساسِ زیاں چلا گیا ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جس پر ہر دلِ دردمند کو خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے کسی تحقیقاتی کمیٹی کو بٹھانے کی ضرورت نہیں۔ جس قدر یہ سوال نمایاں ہے اس سے بھی زیادہ اس کا جواب نمایاں ہے۔ اس کا جواب ہمیں پنڈت جواہر لال نہرو کی اس تقریر میں ملتا ہے جس سے اس نے بھاکرا بند کا افتتاح کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک تجربہ کار و عیار شاطر کی طرح، پنڈت نہرو نے اپنی تقریر کے چار فقروں میں غم و غصہ کی وہ تمام لہر جو اہلِ پاکستان کے دل میں اس کے خلاف امنڈ رہی تھی، نہایت سادگی و پُرکاری سے اس کا رُخ خود پاکستان کے اربابِ حل و عقد کی طرف موڑ دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پہلے سے بھی زیادہ بددل ہو کر رہ گئی۔

اس نے کہا کہ میں اپنی قوم کو درخورِ ہزار تہنیت سمجھتا ہوں کہ اس نے برسوں تک مسلسل کوشش کی جس کا ثمرہ اسے قدرت کی طرف سے اس جوئے شیر کی صورت میں مل رہا ہے۔ ہم ہزار دل سے چاہتے تھے کہ ہماری ہمسایہ قوم (پاکستان) بھی اسی طرح ملک کی ترقی میں ہمارے دوش بدوش چلتی لیکن اس کا کیا علاج کہ وہاں کے اربابِ بست و کشاد کے دل میں نہ ملک کی ترقی کا کوئی ولولہ ہے نہ کام کرنے کی کوئی امنگ، نہ ان میں ندرتِ فکر ہے نہ جوشِ کردار۔ ان میں جو کہیں تھوڑی بہت توانائی ہوتی ہے وہ آپس کی چپقلش کی نذر ہو جاتی ہے۔ ان کی قوم آگے بڑھے تو کس طرح۔ یہ ہیں پنڈت نہرو کی تقریر کے وہ چار فقرے جنھوں نے سحر خاموش کی طرح اہلِ پاکستان کی نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ اور قوم افسردہ سے افسردہ تر ہو کر بیٹھ رہی۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ پنڈت نہرو نے یہاں کی صورتِ حالات کا (اپنے نقطۂ نگاہ سے) بڑی عمدگی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ ہم اسے گالیاں دیکر مطمئن ہو جائیں ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کا یہاں ایسا اثر کیوں لیا گیا؟ ہماری قوم نے بیک زبان کیوں نہ کہدیا کہ تم بکتے ہو۔ اس کے برعکس انھوں نے (الفاظ سے نہیں تو کم از کم اپنے طرزِ عمل سے) کیوں یہ کہدیا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ ہے وہ نکتہ جس پر غور کرنے کے لئے ہم نے اس قصۂ جگر سوز اور حدیث الم انگیز کو دل پر پتھر رکھکر چھیڑا ہے۔ بلا کسی تمہید و معذرت کے اس ناخوشگوار حقیقت کو بادلِ ناخواستہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ اس وقت قوم میں پوری طرح بددلی پھیل چکی اور اس پر نا امیدی چھا چکی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان میں ایسا تخریبی عنصر موجود ہے جس کا کام ہی بددلی پھیلانا اور نا امیدی پیدا کر دینا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہاں اس بددلی اور نا امیدی کے اسباب درحقیقت کوئی نہیں۔ یہ صرف تخریبی عنصر کا پیدا کردہ خیال ہے تو وہ نہ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے بلکہ خود پاکستان سے بھی دشمنی برتتا ہے۔ تخریبی عناصر ان اسباب کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے اور اصلاح کی بجائے فساد انگیزی کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس بددلی اور افسردگی کے حقیقی ذمہ دار ہیں وہ خود ہمارے اربابِ حل و عقد ہیں۔ وہی اس جیتی جاگتی قوم کو موت اور افسردگی کی اس حالت تک لے آئے ہیں کہ اب انھیں اتنا بڑا حادثہ بھی جھنجھوڑ کر اٹھا نہیں سکتا۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ یہ صورتِ حالات پیدا کس طرح سے ہوئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کوئی قوم دوسروں کی محکومی کے بجائے اپنی حکومت کیوں چاہتی ہے اور کیوں (پہلے) اس کے حصول اور (پھر) اس کے تحفظ کے لئے اس قدر قربانیاں دیتی ہے۔ قوم میں ایک طبقہ تو وہ ہوتا ہے جس کے نزدیک ملک کی آزادی کسی بلند نصب العین کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگرچہ اس طبقہ کی تعداد بالعموم تھوڑی ہوتی ہے لیکن قوم کا موثر عنصر یہی ہوتا ہے کیونکہ یہ طبقہ اربابِ فکر و نظر پر مشتمل ہوتا ہے اور قوموں کی زندگی فکر و نظر کے

پیمانوں ہی سے ناپی جاتی ہے۔ ہماری قوم کے اس طبقہ نے حصولِ پاکستان کے لئے اس لئے جدوجہد کی تھی کہ اس کے نزدیک پاکستان کی آزاد سرزمین ہی وہ خطہ بن سکتی تھی جس میں صحیح اسلامی نظام قائم کیا جاسکے اور جو نوعِ انسانی کو ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی ہوسناکیوں اور توہم پرستیوں سے چھڑا کر فلاح و فوز کے راستہ پر لے چلے۔ قوم کے دوسرے (اور کثیر التعداد) طبقہ کے نزدیک آزادی اس لئے ضروری ہوتی ہے کہ وہ سمجھتے اور جانتے ہیں کہ جب ان کی اپنی حکومت قائم ہوگی تو انھیں سکھ اور چین کی زندگی نصیب ہوجائے گی۔ ہمارے عوام نے اسی یقین کی بنا پر تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تھا اور وہ انہی توقعات کو دلوں میں لئے اس سرزمین کی طرف کشاں کشاں چلے آئے تھے اگرچہ انھیں اس میں ہزار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

یہاں صورتِ حالات یہ ہے کہ اول الذکر طبقہ دیکھ رہا ہے کہ ملک میں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت دونوں کی جڑیں مضبوط ہوتی جارہی ہیں۔ اور یہ وہ خبائث ہیں جو صحیح اسلامی نظام کے شجرِ طیب کو کبھی پھولنے پھلنے نہیں دیا کرتے ملوکیت کے معنی یہی نہیں ہوتے کہ ملک میں کسی ایک شخص کی بادشاہت قائم ہوجائے اور پھر وہ وراثتہً اس کی اولاد میں منتقل ہوتی چلی جائے۔ یہ تو ملوکیت کی ایک شکل ہوتی ہے۔ ملوکیت کی روح یہ ہوتی ہے کہ رزق کے سرچشمے (جو اللہ نے تمام انسانوں کی پرورش کے لئے کھلے رکھے تھے) چند افراد کے قبضہ میں آجائیں اور وہ، ان کے بل بوتے پر، دوسرے انسانوں سے اپنے فیصلے منوائیں اور اس طرح انھیں اپنی مفاد پرستیوں کا آلہ کار بنالیں۔ یاد رکھئے، قرآن کی رو سے اس سے بڑھ کر انسانیت کی تذلیل اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کے مفاد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ جائے۔ غلامی کہتے ہی اس کو ہیں۔ پاکستان میں رزق کے سرچشمے سمٹ سمٹا کر چند خاندانوں کے اندر محدود ہوتے چلے جارہے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ زمامِ اقتدار انہی کے ہاتھوں میں آتی جارہی ہے۔ یہی وہ لباسِ نو ہے جس میں عصرِ حاضر میں ملوکیت جلوہ بار ہوتی ہے۔ لہذا یہاں ملوکیت کی جڑیں دن بدن مضبوط ہوتی جارہی ہیں۔ باقی رہی مذہبی پیشوائیت، سو (غیر منقسم) ہندوستان میں اس کی شکل انفرادی تھی لیکن یہاں اس نے جماعتی رنگ اختیار کرلیا ہے۔ اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مذہبی پیشوائیت نے جب اور جہاں بھی ایک جتھے کی صورت اختیار کی ہے وہ انسانیت کی لہلہاتی کھیتیوں کے لئے ٹڈی دل بن گئی ہے۔ ملوکیت کو اپنی مفاد پرستیوں کے تحفظ کے لئے کسی قسم کی ملائیت سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے اور جب "کشتری اور برہمن" کا سمجھوتہ ہوجائے تو پھر باقی انسان "ویش اور شودر" بن کر رہ جاتے ہیں جن کی زندگی کا مقصد دونوں گروہوں کی اطاعت اور خدمت قرار پاجاتا ہے۔ پھر بادشاہ، ظل اللہ بن جاتا ہے اور علماء جانشینانِ رسول، اور ان کی اطاعت بطور رسول کی اطاعت کے قرار پاجاتی ہے۔ یہی وہ صورتِ حالات ہے جس کا تصور اس طبقہ کے لئے بالعموم وجہ یاس اور افسردگی بن رہا ہے جو سرزمینِ پاکستان میں یہ توقعات لیکر آئے تھے کہ یہاں صحیح اسلامی نظام قائم ہوگا جس میں انسانیت نشوونما پائیگی اور آدمیت پروان چڑھے گی۔

باقی رہا عوام کا طبقہ جو یہ سمجھتا تھا کہ پاکستان میں آرام کی زندگی نصیب ہوگی تو ان بیچاروں پر یہاں جو کچھ گذر رہی ہے اس کے لئے اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ صورت ببیں، حالم مپرس. حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ارباب بست و کشاد نے اپنے آپ کو عوام سے اس قدر الگ رکھ چھوڑا ہے اور وہ اس "نچلے طبقہ" سے اتنے دور اور بلند ہو چکے ہیں کہ انھیں اب غالباً اس کا احساس تک بھی نہیں رہا کہ عوام کس طرح زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔ اجنبی حکومت کو اس لئے اجنبی نہیں کہا جاتا کہ وہ کسی دوسرے ملک کے لوگوں کی حکومت ہوتی ہے۔ وہ اجنبی اس لئے ہوتی ہے کہ اس میں عوام اور حکمران طبقہ میں اس قدر بُعد اور غیریت ہوتی ہے کہ لوگ اسے غیروں کی حکومت سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسوقت پاکستان میں بعینہ یہی حالت ہے کہ یہاں کے عوام حکومت کو اپنی حکومت نہیں بلکہ اجنبی حکومت سمجھ رہے ہیں ——— اس سے بھی زیادہ اجنبی جتنی وہ انگریزوں کی حکومت کو اجنبی سمجھتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی بعض شکایات ایسی بھی ہوتی ہیں جو صحیح حالات سے عدم واقفیت کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ اور تخریبی عنصر انھیں اور زیادہ زہر آلود بنا دیتا ہے۔ لیکن ان کی شکایات کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو بالکل جائز اور حقیقت پر مبنی ہے۔ جہانتک پہلی قسم کی شکایتوں کا تعلق ہے ارباب حکومت کی طرف سے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ عوام تک صحیح حالات پہنچا دیئے جائیں تاکہ ان کی غلط فہمی رفع ہو جائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ عوام کی ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے۔ ویسے تو اطلاعات اور نشر و اشاعت کے محکمے موجود ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ ان محکموں کا مقصد کیا ہے۔ کچھ بھی ہو ان کے پیش نظر یہ تو بالکل نہیں کہ عوام تک صحیح حالات پہنچا کر ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے۔ اگر حکومت کے نزدیک ان محکموں کا مقصد یہی ہے تو وہ اس مقصد کے حصول میں بُری طرح سے ناکام رہے ہیں۔ اور پاکستان کے خزانۂ عامرہ کا اسقدر کثیر روپیہ بالکل ضائع جا رہا ہے۔ باقی رہیں عوام کی جائز شکایات تو ان کے متعلق ہار تھک کر یہی سمجھ لینا پڑتا ہے کہ ان حضرات کے پاس وہ آنکھیں ہی نہیں جو اس عذاب کو دیکھ سکیں جس میں یہ کروڑوں انسان بری طرح سے مبتلا ہیں۔ وہ کان ہی نہیں جن سے وہ اس چیخ و پکار کو سن سکیں جن سے اس وقت ساری فضا ماتم کدہ بن رہی ہے۔ اور اگر آنکھیں اور کان ہیں تو پھر ان کے سینہ میں وہ دل ہی نہیں جو جہنم کے ان شعلوں کے تمازت سے ذرا بھی پگھل سکے جس میں قوم اس بری طرح سے جھلس رہی ہے اور تو اور غالباً ان کے کندھوں پر وہ سر بھی نہیں جو اس خطرہ ہی کا اندازہ کر سکے جو ملک کے لئے (بلکہ خود ان کے اپنے لئے بھی) اس صورتِ حالات سے پیدا ہو رہا ہے اور اس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جہانبانی کے لئے دردمندی کو چھوڑیئے، کم از کم دانشمندی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہاں تو درد ہے نہ دانش۔ ملک کے عوام (اور عوام سے مراد ہیں بڑے طبقہ کو چھوڑ کر باقی تمام اہلِ پاکستان) ایک عذاب مسلسل سے گذر رہے ہیں۔ اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کسی کو اطمینان کا سانس نصیب ہو۔ دردمندی کا تقاضا تھا کہ اس جہنم کو دیکھ کر

ذمہ دار حضرات کا دل خون بن کر آنکھوں سے بہہ نکلتا اور ان پر دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی۔ لیکن ہمارے یہ جاندار ہیں کہ کیا مجال جو ان کی عشرت سامانیوں میں ذرا سا بھی خلل پڑ جائے۔ اسے بھی چھوڑیئے، تخریبی عناصر (بالخصوص کمیونزم کے حامی) عوام کی اس ابتر حالت سے فائدہ اٹھا کر ملک میں ایسا انتشار برپا کر رہے ہیں جس میں بڑے مہیب خطرہ کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ دانشمندی کا تقاضا تھا کہ یہ حضرات ملک کے نہیں تو کم از کم خود اپنے مفاد کے تحفظ کی خاطر ہی ان حالات کو اتنا بگڑنے نہ دیتے کہ یہ کوہِ آتش فشاں پھٹ کر دوسروں کے ساتھ خود ان کے لئے بھی سامانِ ہلاکت نہ بن جائے۔ لیکن حیرت ہے کہ یہ جذبہ بھی ان کے لئے اصلاحِ حال کا محرک نہیں بن رہا۔ ان حالات سے اگر عوام میں بددلی اور ناامیدی نہ پھیلے تو اور کیا ہو۔ اس بددلی اور افسردگی کے سب سے بڑے مراکز خود حکومت کے دفاتر ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ملک کے باشندوں کے لئے حکومت (یا ان کے الفاظ میں سرکار) نام ہے انہی دفاتر کا۔ ان دفاتر کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ کوئی شخص نہیں جسے ان سے کچھ واسطہ پڑے اور وہ وہاں سے روتا ہوا باہر نہ نکلے۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ لوگ اب مصیبتیں برداشت کر لینے اور نقصان اٹھا لینے کو اس پر ترجیح دیتے ہیں کہ وہ ان دفاتر میں جا کر اپنے حقوق کی دادرسی چاہیں۔ اس لئے کہ باہر تو صرف نقصان ہی ہوتا ہے لیکن یہاں آ کر نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے اور ذلیل بھی ہونا پڑتا ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ یہ خداوندانِ دفاتر لوگوں کے اس نقصان سے خوش ہوتے اور ان کی ذلت سے مزہ لیتے ہیں۔

مکانوں کی پگڑی اور سرکاری محکموں کی رشوت اب ایسا معمول قرار پا چکی ہے جسے نہ کوئی دیتے جھجکتا ہے نہ لیتے شرماتا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی چیزیں دن بدن کمیاب اور گراں بہا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اول تو یہی پتہ نہیں چلتا کہ فلاں چیز دستیاب کہاں سے ہوگی اور اگر کسی کو اشاروں ہی اشاروں میں پتہ چل جائے تو پھر "اندھیر منڈی" میں اس کی قیمت اتنی ہوتی ہے کہ خریدنے والا اپنی جیب ٹٹول کر رہ جاتا ہے۔ بے شمار لوگ وہ ہیں جنہیں تلاش اور جستجو کے باوجود کوئی کام ہی نہیں ملتا کہ وہ کما کر لائیں اور بچوں کی پرورش کر سکیں۔ جو کما کر لاتے ہیں انہیں کھانے پینے کی کوئی خالص چیز دستیاب نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی صحت دن بدن گرتی چلی جا رہی ہے۔ لاتعداد بچے ایسے ہیں جن کے لئے اسکولوں میں کوئی جگہ نہیں اور جن خوش نصیبوں کو داخلہ مل جاتا ہے انہیں وہاں تعلیم نہیں ملتی۔ بے شمار مریض ایسے ہیں کہ جنہیں ہسپتالوں میں باریابی نہیں ہوتی۔ جنہیں شرفِ باریابی حاصل ہو جاتا ہے انہیں دوائی نہیں ملتی۔ لوگ بیچارے رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، پکار رہے ہیں لیکن اس صحرائے اعظم میں کوئی سننے والا ہی دکھائی نہیں دیتا۔ کیا اس کے بعد بھی آپ لوگوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ بددل اور ناامید نہ ہوں۔ بددلی اور ناامیدی تو ایک طرف رفتہ رفتہ لوگوں نے زندگی کے سیدھے اور واضح طریقے چھوڑ کر ہر معاملہ میں بیسر اور چوربازاری کے پرپیچ و خم راستے اختیار کرنے شروع کر دیئے ہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ملک کے اندر تخریبی عناصر موجود ہیں جو پاکستان بننے سے پہلے بھی تحریکِ پاکستان کے خلاف تھے اور اب بھی اس کے درپئے تخریب ہیں۔ باہر سے ایک طرف ہندوستان ہے جو مسلسل اسی فکر میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ دوسری طرف کمیونزم کا سیلاب ہے جو آتشیں لاوے کی طرح بڑھتا چلا آرہا ہے آپ سوچئے کہ ان حالات میں ملک کے اندر بددلی اور نا امیدی کے وجوہ واسباب کا بڑھتے چلے جانا کس قدر مہیب خطرہ کا موجب ہے۔ ہار تھک کر انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ہمارے ذمہ دار حضرات کو یا تو

(۱) ان حالات کا علم ہی نہیں جو ملک میں پیدا ہو چکے ہیں ـــــ یا

(۲) وہ ان کے علاج کی طرف دانستہ متوجہ نہیں ہوتے ـــ اور یا

(۳) ان کا علاج ان کے بس کی بات ہی نہیں۔

ان میں سے کوئی سی بھی صورت ہو ملک کے لئے اس کا نتیجہ ہر حال میں یکساں ہے اور بالکل واضح۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ملک کی موجودہ قیادت اس باب میں (دانستہ یا نادانستہ) کچھ نہیں کرتی یا کچھ کرسکنے کی اہل نہیں تو کیا ملک کے دوسرے لوگوں کا فریضہ فقط اتنا ہی ہے کہ وہ ان پر تنقید کرکے مطمئن ہو جائیں؟ اگر کشتی کے ملاح سو جائیں یا چپو رکھکر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہو جائیں تو کیا اہلِ کشتی کا اتنا ہی کام ہے کہ وہ یہ کہہ کر کہ یہ ملاح کیسے نااہل لوگ ہیں خود حقہ پینے بیٹھ جائیں؟ کیا کشتی کے ڈوبنے سے فقط ملاحوں کا نقصان ہوگا، اہلِ کشتی کا کچھ نہیں بگڑے گا؟ سوچئے کہ یہ سوچنے کی باتیں ہیں۔ ملک میں یقیناً ایک ایسا طبقہ موجود ہے جن میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت ہے اور وہ دل سے چاہتے ہیں کہ پاکستان کو ہر طرح کی سرفرازی اور سربلندی نصیب ہو۔ اس طبقہ کے حصولِ پاکستان کی تحریک کے لئے بڑی ہمت اور جفاکشی سے کام لیا اور یہاں آنے کے بعد بھی وہ شروع شروع میں بڑا گرم جوش تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اب رفتہ رفتہ ان لوگوں کی بھی یہ حالت ہو چکی ہے کہ وہ حالات کا جائزہ نہایت صحیح انداز سے لیتے ہیں اور موجودہ خرابیوں کے اسباب وعلل کی صحیح تشخیص بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ کہہ کر اٹھ جاتے ہیں کہ حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ اب ان کا سدھرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہم اس قسم کے مخلص احباب سے اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ وہ کبھی تنہائی میں بیٹھکر سوچیں کہ ان کا یہ اندازِ فکر (شعوری نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر) کہیں بے عملی اور سہل انگاری کا بہانہ تو نہیں بن رہا۔ کہیں یہ تو نہیں ہو رہا کہ ان کی عقل بہانہ تراش یہ کہہ کر کہ اب مرض لاعلاج ہو چکا ہے ان کی بے عملی کے لئے دلائل وضع کر رہی ہے۔ قرآن نے اس قسم کی عقل فریب کار کا نام ابلیس رکھا ہے۔ اس لفظ کا مادہ بَلَسٌ ہے اور بَلَسٌ کے معنی ہیں نا امیدی۔ یعنی ابلیس کا کام یہ ہے کہ وہ نا امیدی پیدا کر دیتا ہے۔ اور نا امیدی، بے عملی کا نہایت اطمینان بخش بہانہ بن جاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ یہ کہیں کہ

مریض اچھا ہو سکتا ہے تو پھر آپ کو اس کے علاج کے لئے تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اگر آپ یہ فیصلہ کر لیں کہ مریض بچ نہیں سکتا، اس کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے تو اس کے بعد آپ کو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا۔ یہی وہ ابلیسی حربہ ہے جو آپ کو عمل سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اور اس بے عملی کے لئے نہایت خوش آئند دلیل تراش کر دیتا ہے کہ جب مرض لاعلاج ہے تو پھر علاج کے لئے کوشش بے معنی ہے۔ اس کے برعکس قرآن اپنے ماننے والوں کو کبھی ناامید نہیں ہونے دیتا۔ لہٰذا آپ سوچئے کہ کہیں آپ بھی اس ابلیس کا شکار تو نہیں ہو رہے۔ جب آپ کا ذہن یہ کہے کہ یہاں کے حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ ان کے سنورنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تو آپ اپنے دل سے پوچھئے کہ میں نے ان حالات کے سنوارنے کے لئے کیا عملی کوشش کی ہے جس کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حالات سدھر ہی نہیں سکتے۔ یہی سوال آپ ہر اس شخص سے کیجئے جو یہ کہہ کر اٹھنا چاہے کہ یہاں کے حالات ناقابلِ علاج ہو چکے ہیں۔ قرآن نے اصلاح احوال کے لئے پہلا قدم ہی یہ تجویز کیا ہے کہ تم زمانہ کی رو میں یونہی بہتے نہ چلے جاؤ۔ تم ایک ایک لمحہ کے لئے رُکو ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا اور پھر سوچو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یا کر رہا ہوں اس کے لئے میرے پاس دلیل کیا ہے؟ میں اس نتیجہ پر کس طرح پہنچا؟ میں یہ کچھ کیوں کہہ رہا ہوں؟ میرے اس فیصلہ کی بنیاد کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ جب تم نے اس طرح رک کر سوچنا شروع کر دیا تو تم نے درحقیقت تبدیلیٔ حالات کی محکم بنیاد رکھ دی۔ لہٰذا آج جبکہ ہمارے اربابِ حل و عقد کی کوتاہ نگہی اور مفاد پرستی اور تخریبی عناصر کی بداندیشی اور مفسدہ پردازی نے ملک میں بددلی اور ناامیدی کی وبا عام کر دی ہے، اس طبقہ کے لئے جو اپنے دل میں اصلاحِ حال کی سچی تڑپ رکھتا ہے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ناامیدی کے اس ابلیسی طلسم کو توڑے اور دل کے پورے یقین کے ساتھ اس کا اعلان کرے کہ دنیا کی کوئی مشکل ایسی نہیں جس پر قابو نہ پایا جا سکتا ہو۔ اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہمارے حالات ایسے ہو چکے ہیں جو کسی طرح سنور نہیں سکتے۔ لہٰذا ہماری سب سے پہلی درخواست یہ ہے کہ آپ اپنے حلقۂ اثر میں ان خیالات کو عام کرنا شروع کیجئے اور اس طرح ان لوگوں کا ایک دائرہ بناتے چلے جائیے جو اس حقیقت پر محکم یقین رکھیں کہ حالات سنور سکتے ہیں اور ضرور سنور سکتے ہیں۔ خرابیاں دور ہو سکتی ہیں اور ضرور دور ہو سکتی ہیں۔ آپ مسلمان سے پوچھئے کہ اس کا یہ ایمان ہے یا نہیں کہ قرآن نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے؟ جب وہ نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل پیش کرنے کے قابل ہے تو کیا وہ ہماری اس مشکل کا حل کوئی نہیں بتا سکتا؟ ایسا سمجھنا تو قرآن کی عالمگیر رہنمائی سے انکار کرنے کے مرادف ہوگا۔ جب اس قسم کا یقین رکھنے والے دس بیس آدمی بھی سر جوڑ کر بیٹھیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اصلاحِ حال کے لئے آغازِ کار کی کوئی نہ کوئی شکل ان کے سامنے ضرور آ جائے گی۔ اس وقت جو ہمیں کچھ نہیں سوجھتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے تحت الشعور میں اس یقین کو لیکر نہیں بیٹھتے کہ حالات ضرور سدھر سکتے ہیں۔ جب آپ اس یقین کو لیکر بیٹھیں گے تو آپ کو

ضرور کوئی نہ کوئی راستہ نظر آجائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اصلاح حال کی جو تدبیریں آپ کے سامنے آئیں ان میں کچھ خامیاں ہوں۔ لیکن خامیوں سے کبھی گھبرانا نہیں چاہیئے۔ تجربہ ان خامیوں کو خود بخود دور کر دیگا۔ البتہ آپ جو تدبیریں بھی سوچیں ان میں ایک اصول کو ضرور پیش نظر رکھیں اور وہ یہ کہ حکومت اور مملکت میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ حکومتیں آتی ہیں اور جاتی ہیں۔ وزارتیں بنتی ہیں اور ٹوٹتی ہیں لیکن مملکت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ آپ اصلاحِ حال کے لئے غلط کار حکومت کو ضرور بدلئے۔ آپ ملک اور نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے نقصان رساں نظام کی جگہ منفعت بخش اور انسانیت ساز نظام کو قائم کیجئے۔ لیکن اس تبدیلی کی کوشش میں کوئی قدم ایسا نہ اٹھایئے جس سے مملکت کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو اصلاح حال کے لئے آپ کی اس کوشش کی مثال اس ڈاکٹر کے علاج کی سی ہوگی جس نے بڑے فخر سے اعلان کیا تھا کہ آپریشن بہت کامیاب رہا۔ بس اتنا ہوا کہ مریض نہ بچ سکا۔ اس بنیادی نکتہ کو سامنے رکھکر ہر غلط نظام کو بدلنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اب رہا یہ کہ غلط نظام کی جگہ صحیح نظام کونسا ہوسکتا ہے سو ہم لوگوں کے لئے اس کا فیصلہ بھی کچھ مشکل نہیں۔ مسلمانوں کی مملکت کے لئے صحیح نظام وہی ہوسکتا ہے جسے قرآن کی سند حاصل ہو۔ (یاد رکھئے "مذہب" کی سند نہیں، بلکہ قرآن کی سند۔ مذہب انسانوں کا بنایا ہوا راستہ ہوتا ہے۔ مذہب کے معنی ہی راستہ ہیں لیکن خدا کی طرف سے دیئے ہوئے دین کی سند قرآن ہے۔) لہٰذا اسلامی نظام کے لئے سند صرف قرآن کی ہونی چاہیئے۔ آپ کہیں گے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ قرآن کی سند کس نظام کو حاصل ہے اس لئے کہ ہر شخص اپنے پیش کردہ تصور کے متعلق یہی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہے۔ آپ یہ سوچئے کہ اگر قرآن ایسی ہی کتاب ہے کہ جو ہر غلط اور صحیح تصور کو سند عطا کر دیتا ہے تو اس قسم کی کتاب اس قابل ہو ہی نہیں سکتی کہ اسے راہنمائی کے لئے قبول کیا جاسکے۔ قرآن نے تو اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل ہی یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس لئے اس سے دو مختلف نظریوں کو کبھی سند نہیں مل سکتی۔ قرآن صرف ایک ہی نظامِ حیات اور ایک ہی تصورِ زندگی پیش کرتا ہے۔ اس کے سوا وہ ہر نظام اور ہر تصور کی تردید کرتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہر شخص جو دعویٰ کرتا ہے کہ میرا نظریہ قرآن کے مطابق ہے اسے ضرور قرآنی سند حاصل ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ قرآن کوئی گپت وِدّیا (مخفی علم یا باطنی تعلیم) کا مجموعہ نہیں۔ اس کی تعلیم بڑی واضح اور کھلی کھلی ہے اور سمجھنے کے لئے بہت آسان ہے۔ اس لئے یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ کس نظام کو قرآن کی سند حاصل ہے۔ طلوع اسلام نے جو نظام پیش کیا ہے اس کی ایک ایک شق کو قرآن کی سند کے ساتھ پیش کیا ہے اور آج تک کوئی شخص قرآن کی رو سے اس کی تردید نہیں کرسکا۔ اس نظام کی تفصیلات تو

طول طویل ہیں۔ لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) رزق کے سرچشمے کسی فرد کی ملکیت قرار نہیں پا سکتے۔ انھیں تمام افرادِ معاشرہ کی نشوونما کے لئے کھلا رہنا چاہئے۔

(۲) ہر فردِ معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ دوسرے افراد کی نشوونما اور پرورش و تربیت کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔

(۳) حکومت کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہو۔ جس مملکت میں کوئی ایک فرد بھی اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائے وہ نظام اسلامی نہیں قرار پا سکتا۔ اور چونکہ اسلامی نظام میں رزق کے سرچشموں پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی باقی نہیں رہتا اس لئے اس میں لوٹ کھسوٹ، سلب و نہب اور ظلم و استبداد خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے وہ قرآنی نظام جس کے قیام سے معاشرہ کی تمام خرابیاں خود بخود رفع ہو جاتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ پاکستان میں اس نظام کے قیام کے لئے کیا کیا جائے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس تبدیلی کے لئے موجودہ قیادت کی تبدیلی ضروری ہے۔ یہ تبدیلی بہرحال آئینی ہوگی۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ مجلس آئین ساز پاکستان کے دستور کی تدوین کو جلد از جلد مکمل کر رہی ہے۔ اس دستور سے ہمیں کچھ خوشی نہیں۔ خوشی یہ ہے کہ اس سے پورے ملک میں جدید انتخابات کا موقع پیدا ہو جائے گا۔ یہ جدید انتخابات پاکستان کے مستقبل کے لئے ایک آخری موڑ ہوں گے۔ اگر ان انتخابات میں اکثریت ان لوگوں کی آ گئی جو اس اسلامی نظام کے تصور کے حامی ہوں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے تو پھر اس طبقہ کی آرزو بھی پوری ہو جائے گی جو یہاں صحیح اسلامی نظام کے قیام کا متمنی ہے۔ اور عوام کی یہ آرزو بھی پوری ہو جائے گی کہ زندگی سکھ اور چین سے بسر ہونی چاہئے اور جب یہ ہو جائے گا تو پھر ہندوؤں کو بھی بتایا جا سکے گا کہ ہمسایہ اقوام کے ساتھ کس قسم کا سلوک شایانِ انسانیت ہوتا ہے۔ ہندو صرف تلوار کی زبان سمجھ سکتا ہے اور ہم یہ زبان اس وقت بول سکتے ہیں جب ہمارے عوام یہاں کی زندگی کو اپنے اور اپنی آل و اولاد کے لئے جنت کی زندگی سمجھتے ہوں۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اسے مختصر الفاظ میں دہرا لیجئے کہ آپ کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) اپنے دل میں یہ یقین پیدا کر لیجئے کہ ہمارے حالات یقیناً سنور سکتے ہیں لہٰذا ہمارے لئے ناامید ہونے کی کوئی وجہ

نہیں ہے جس قوم کے پاس قرآن جیسا راہنمائی کا ضابطہ ہو اس کے لئے مایوسی کفر ہے۔

(۲) اپنے حلقۂ اثر میں اس خیال کو عام کیجئے کہ ہمارے حالات سدھر سکتے ہیں۔ اور جو لوگ اس یقین کو اپنے دل میں پیدا کرتے جائیں اُن کا ایک حلقہ قائم کرتے چلے جائیے۔

(۳) یہ تہیہ کر لیجئے کہ آپ نے آنیوالے انتخابات میں ان لوگوں کو کامیاب کرانا ہے جو قرآن کے نظامِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں۔ قرآن کا نظام ربوبیت یہ ہے کہ رزق اور دولت کے سرچشمے کسی کی ذاتی ملکیت نہ رہیں بلکہ یہ تمام افراد معاشرہ کی پرورش اور نشوونما کے لئے کھلے رہیں گے۔

آپ ان خیالات کو عام کرتے جائیے اور طلوع اسلام اس نظام کے مختلف گوشوں کو آپ کے سامنے روشن کرتا چلا جائے گا۔ اگر آپ اس مختصر سے پروگرام کے دیئے کو لیکر اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ نے چلنا شروع کر دیا تو آپ دیکھیں گے کہ راستہ کی تمام تاریکیاں کس طرح چھٹتی جاتی ہیں اور دنیا کس طرح اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیش نظر لایخلف المیعاد دار

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن ــــ جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم اور سیرتِ صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گرد پوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس ۲۰ روپے۔ محصول ڈاک و پیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

طلوعِ اسلام نے آج تک

نہ کسی سے مالی مدد مانگی ہے۔ نہ اب مانگ رہا ہے۔ البتہ اس کی ایک اسکیم ہے جس کی روسے آپ اسے ایک پیسہ بھی مفت نہیں دیتے لیکن اسے قرآنی لٹریچر کی اشاعت میں سہولت بہت ہو جاتی ہے۔ اسکیم یہ ہے کہ اگر آپ ایک سو روپیہ (یک مشت یا چار مساوی ماہانہ اقساط میں) ادا کردیں تو آپ کا حساب کھول لیا جائے گا اور اس حساب میں ہم آپ کو رسالہ طلوع اسلام اور اس کی شائع کردہ کتابوں میں سے جو بھی آپ کو مطلوب ہوں بھیجتے چلے جائیں گے تا آنکہ آپ کا ایک سو روپیہ پورا ہو جائے۔ اس کے بعد آپ پھر اسی طرح پیشگی روپیہ جمع کرا سکتے ہیں۔ اگر ہم کسی وجہ سے اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکیں تو آپ کا بقایا روپیہ آپ کو واپس کر دیا جائے گا۔

یہ اسکیم قریب ایک سال سے جاری ہے اور اس عرصہ میں ہم ایک درجن سے زائد کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ سابقہ ماہ تک ان

پیشگی خریداران

کی تعداد ۲۲۴ تک پہنچ گئی تھی۔ اب ان میں حسب ذیل مزید اضافہ ہوا ہے:-

درگئی	۲۲۵	اعجاز حسین صاحب
گجرات	۲۲۶	زبیدہ خانم صاحبہ معرفت میاں برکت علی صاحب
لاہور	۲۲۷	چودہری محمد حسین صاحب
کویت	۲۲۸	محمد جہانگیر صاحب
سیالکوٹ	۲۲۹	اہلیہ محمد صدیق صاحب
کراچی	۲۳۰	ڈاکٹر حبیب الرحمٰن صاحب
دھران	۲۳۱	محمد آصف صاحب
ملیر چھاؤنی	۲۳۲	نام کی اشاعت نہیں چاہتے۔
ڈھاکہ	۲۳۳	بیگم شیخ عبدالحمید صاحب
دھران	۲۳۴	اشرف درانی صاحب
کراچی	۲۳۵	کپتان عتیق احمد صاحب

اگر آپ ابھی تک "پیشگی خریداران" کی اسکیم میں شامل نہیں ہوئے، تو اس پر غور فرمائیے کہ اس اسکیم کی روسے آپ ایک پیسہ بھی زائد نہیں دیں گے اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں ہمیں بہت آسانی ہو جائے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ قیمت پیشگی دیدیتے ہیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

ادارۂ طلوع اسلام کی مطبوعات ایک نظر میں

معراج انسانیت
ترجمانِ حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام خود قرآن کے آئینے میں جو اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ ابتدا میں تقریباً پونے دو سو صفحات پر دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات۔ جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات۔ کاغذ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط و حسین گردپوش مرصع و دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش و رنگین۔ قیمت بیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

نوادرات
علامہ حافظ محمد اسلم صاحب کے نادر مضامین کا قابل قدر مجموعہ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت صرف چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

اسلامی نظام
دورِ حاضرہ کی ایک بلند پایہ کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم صاحب جیراجپوری کے وہ مقالات شامل ہیں جنہوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولدی ہیں ضخامت ۱۸۴ صفحات مجلد مع گردپوش قیمت دو روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی دستورِ پاکستان
آئینی جدوجہد کے سلسلے میں ادارہ طلوع اسلام کی پیشکش قرآن کی روشنی میں مسودات قرار داد مقاصد بنیادی اصول و حقوق جو حکومت کے اعلان کے جواب میں بھیجے گئے ساتھ ہی حکومت کی جانب سے پاس کردہ قرار داد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات پر تبصرہ ضخامت ۲۴۴ صفحات مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے۔

اسبابِ زوالِ امت (پرویز)
دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب۔ مختصر مگر ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ۔ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا؟ صفحات ۱۵۰۔ مجلد طلائی گردپوش قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

تین اہم عنوانات
ملا کے مذہب کے عجیب و غریب حقائق مثلاً (۱) تبدیل مذہب کرنے والوں کو قتل کر دیا جائیگا (۲) غلام اور لونڈیاں بے حد و نہایت بلا نکاح حرم سراؤں کی زینت بنائی جا سکیں گی (۳) یتیم پوتوں کو وراثت سے محروم رکھا جائیگا۔ قرآن کی روشنی میں ملا کے خود ساختہ مذہب کا ابطال اور تینوں مسائل کا حل اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

سلیم کے نام خطوط
محترم پرویز صاحب کے قلم سے۔ ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جس قدر شکوک پیدا ہو گئے ہیں ان کا نہایت شگفتہ، شاداب اور سائنٹفک انداز میں تسکین بخش جواب۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آرا مسائل حل کر کے رکھدیئے گئے ہیں جنہیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جا سکا تھا۔ ضخامت بڑے سائز کے ۴۲۵ صفحات مجلد مع حسین گردپوش قیمت چھ روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی فیصلے
دورِ حاضر کی ایک اہم کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے کہ ان مسائل و معاملات میں قرآن پاک کا کیا فیصلہ ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے سہاروں سے بے نیاز کر دیگی ضخامت ۴۰۸ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

جشن نامے
بلند حقائق کا مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع ایسے ایسے عنوانات جنہیں پڑھکر بیک وقت آپکے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں طنز اور تنقید کے ایسے گہرے نشتر، اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ یہ کتاب ہمارے چھ سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ہے ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے۔ (علاوہ محصولڈاک)

ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

کراچی کی ایک شام[1]

شروع جولائی کا ذکر ہے۔ اتوار کی ایک شام میرے ہاں کچھ احباب جمع تھے، یونہی، بلا تقریب۔ ان میں ارشدؔ، حامدؔ اور فیضیؔ خاص طور پر قابلِ تعارف ہیں۔ تینوں تعلیم یافتہ اور شریف، ذوق نہایت پاکیزہ اور طینت بڑی نیک۔ ارشدؔ، فوج میں افسر ہے اور حامدؔ اور فیضیؔ سول میں۔ ارشدؔ اور حامدؔ کی مذہبی معلومات کم ہیں لیکن دل میں مذہب کا بڑا احترام ہے۔ چونکہ روشن خیال ہیں اس لئے مذہبی توہم پرستیوں کو پسند نہیں کرتے۔ جن باتوں سے اسلام کے نام پر دھبہ آتا ہو یا مسلمان بدنام ہوتے ہوں، ان سے انھیں سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ فیضی کی ابتدائی تعلیم مذہبی رنگ میں ہوئی ہے اس لئے مذہب کے متعلق اس کی معلومات کافی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تعلیم اس مذہب کی تھی جو ہمارے دورِ جمود و تعطل کی یادگار ہے، اور فیضیؔ بڑا ذہین اور نقاد واقعہ ہوا ہے، اس لئے اس تعلیم کا جو ردِ عمل ہونا چاہتے تھا وہ ظاہر ہے۔ وہ اس مذہب کے خلاف یکسر طنز بن چکا ہے۔ دوسری طرف ملازمت کے سلسلہ میں اس پر کچھ ایسی زیادتیاں ہوئی ہیں جن کی وجہ سے اسے موجودہ نظم و نسق کے خلاف سخت شکایات پیدا ہو چکی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حکومت کو جلی کٹی سناتا رہتا ہے۔ دل میں مسلمان اور پاکستان دونوں کا درد ہے لیکن دونوں کی طرف سے اس طرح کا زخم خوردہ ہے کہ اب اس کی بات بات میں طعن و تشنیع اور طنز و اعتراض ہوتا ہے۔ میں اپنے حلقۂ احباب میں ملّاجی مشہور ہوں اس لئے کہ میری الماریوں میں کتابوں کا بیشتر حصہ مذہب سے متعلق ہوتا ہے۔

اس شام، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اب مجھے یاد نہیں پڑتا کہ بات میں سے بات کیسے نکلی کہ ارشد نے کہا "رات ہمارے محلہ کی مسجد میں وعظ تھا۔ کوئی بہت بڑے مولوی صاحب تشریف فرما تھے۔ لاؤڈ اسپیکر لگ رہا تھا اس لئے اڑوس پڑوس والوں کو مسجد میں جانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وعظ خود بخود ان کے گھروں کے اندر پہنچ رہا تھا۔"

فیضی نے بات کاٹتے ہوئے کہا، "اپنا اپنا نصیب ہے۔ کسی کے کانوں میں سرودِ خانۂ ہمسایہ" خود بخود پہنچتا ہے جو حلال بھی ہوتا ہے اور نزدِ شرع درست بھی۔ تمہارے کانوں میں از خود کچھ پہنچا بھی تو مولوی صاحب کا وعظ جو نزدِ شرع درست ہو تو ہو لیکن اس کے حلال ہونے کے متعلق کم از کم میں تو فتویٰ دے نہیں سکتا۔

ارشد: ذرا سن تو لو۔ وعظ بڑے مزے کا تھا۔ حضور سرورِ کائناتؐ کے معراج کا ذکر تھا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ جبریلؑ ایک براق لایا جو خچر جتنا بڑا تھا۔ حضورؐ اس پر سوار ہونے لگے تو وہ بدکا۔ جبریلؑ نے اس کے کان میں کچھ کہا جس سے وہ ہمہ تن تعظیم بن گیا۔ اس پر سوار ہو کر آپ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ وہاں اسے ایک بہت بڑے پتھر سے باندھ دیا اور خود آسمان پر تشریف لے گئے۔ اس۔۔۔

---

[1] نام اور مقام فرضی ہیں۔

بعد مولوی صاحب نے جو وہاں کا نقشہ کھینچا ہے تو یقین مانو میں بستر پہ لیٹے تلملا رہا تھا۔ کسی کا سر ہتھوڑوں سے کچلا جا رہا تھا، کسی کی زبان لٹکی ہوئی تھی، کسی کے ہونٹ کٹ رہے تھے، کسی کو آگ سے داغ دیا جا رہا تھا۔ آخر میں کہا کہ جب حضورؐ واپس تشریف لائے ہیں تو حضرت موسیٰؑ نے پوچھا کہ خدا نے کیا حکم دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ آپ کی امت سے یہ کبھی پوری نہیں ہوں گی۔ ابھی جا کر ان میں تخفیف کرا لاؤ۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے اور اللہ میاں نے انھیں پچیس کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا کہ یہ بھی بہت زیادہ ہیں۔ اس پر آپ پھر واپس گئے۔ چنانچہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ آپ جاتے۔ اللہ میاں کچھ کم کر دیتے۔ آپ واپس تشریف لاتے تو حضرت موسیٰ پھر کہتے کہ یہ بھی زیادہ ہیں۔ آپ پھر تشریف لے جاتے۔ اسی طرح ہوتے ہوتے بات پانچ نمازوں پر آ گئی۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ یہ بھی زیادہ ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اب تو مجھے بار بار جاتے شرم آتی ہے۔ چنانچہ اس طرح پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ میں اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے یہ سب کچھ سن رہا تھا اور جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی غیر مسلم ان باتوں کو سن لے تو وہ اسلام کے متعلق کیا کہے؟ میں تو اس وقت سے سوچ رہا ہوں کہ اگر کوئی ان باتوں کے متعلق مجھ سے پوچھ بیٹھے تو میں اس کا کیا جواب دوں۔

حامد: ہمارا جواب صاف ہے کہ یہ سب باتیں ان قصہ گو واعظوں کی خود ساختہ ہیں۔ اسلام کو ان سے کچھ واسطہ نہیں!

فیضی: ذرا اس قسم کی باتیں سنبھل کر کیا کرو۔ آج تو تم نے زبان کھول دی۔ کل کو جب یہاں نظام شریعت رائج ہو گیا تو اس وقت کہیں ایسا کچھ نہ کہہ دینا۔

حامد: کیوں! اس وقت کیا ہو گا؟

فیضی: بھٹے کی طرح سر اڑ جائے گا۔

حامد: وہ کیوں؟

فیضی: اس لئے کہ شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے اور مرتد وہ ہے جس کے عقائد درست نہ ہوں۔ جس کسی کے متعلق مُلّا نے فتویٰ دے دیا کہ اس کے عقائد باطل ہیں وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اسلامی حکومت پہ لازم آ جائے گا کہ اس کا سر قلم کر دے۔

ارشد: فیضی! تم کو تو شریعت کے نام سے اسقدر چڑ ہو گئی ہے کہ اب جو جی میں آتا ہے شریعت کے سر تھوپ دیتے ہو۔

فیضی: (میری طرف مخاطب ہو کر) کیوں بھئی ملا جی! کیا تمہاری شریعت کا یہی حکم ہے یا میں اسے خواہ مخواہ اس کے سر تھوپ رہا ہوں؟

میں نے مسکرا کر کہا کہ اس وقت تو تم ٹھیک کہتے ہو۔

اس پر ارشد اور حامد دونوں چونک اٹھے اور ارشد نے بے ساختہ کہا کہ کیا کہا آپ نے! میں نے پھر آہستہ سے کہا کہ فیضی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس پر حامد نے کہا کہ اگر مجھے مجبور کیا گیا کہ میں اسی کو اسلام سمجھوں جسے مولوی صاحب نے اپنے بیان میں بیان کیا تھا تو آپ بھلا مانیں یا نہ مانیں میں تو ایسے اسلام کو سات سلام کروں گا۔

فیضی: لیکن یوں ہونے سے تو آپ پھر بھی نہیں بچ سکیں گے۔ آپ کو پھر بھی قتل کر دیا جائے گا۔

حامد: یعنی میں اگر مسلمان نہ رہنا چاہوں تو بھی مجھ پر مُلّا کی شریعت ہی کا حکم نافذ ہوگا؟

فیضی: یہی تو آپ کا جرم ہوگا۔ آپ مسلمانوں کے گھر پیدا ہو کر اپنا مذہب تبدیل نہیں کر سکتے۔ ایسا کریں گے تو آپ واجب القتل ہوں گے۔

حامد: (نہایت تعجب سے) یعنی میں اگر عیسائی ہوں تو عیسائیت چھوڑ کر مسلمان ہو سکتا ہوں۔ لیکن اگر مسلمان ہوں تو عیسائی نہیں ہو سکتا؟ اگر یہی صورت ہے تو پھر وہ مذہبی آزادی کیا ہوئی جس کا اسقدر چرچا کیا جا رہا ہے اور جس کے متعلق ہر اسٹیج اور منبر سے غلغلہ بلند ہوتا ہے کہ اسلام نے دنیا سے غلامی کو مٹایا اور انسانوں کو سچی آزادی اور حریت عطا کی؟

فیضی: جی! غلامی کو مٹایا!! اب اگر میں نے کچھ اور کہہ دیا تو پھر نیچے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاؤ گے کہ تم نے حقیقت کے سر پر بھی دھوکا دیا۔ حضور! آپ کی شریعت حقہ میں یہ بھی موجود ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جائے۔ اور ان لونڈیوں کو بغیر نکاح کے۔ اور جتنی جی چاہے، گھروں میں ڈال لیا جائے۔

ارشد: جب ایک دفعہ تمہارا رستہ کھل جائے تو پھر اس شتر بے مہاری کی کوئی حد نہیں رہتی۔

فیضی: جی سرکار! بجا فرمایا آپ نے۔ میرا تو بھلا رستہ کھل چکا ہے۔ ذرا ان سے پوچھیے جو گاڑی کھاڑی... ہم بیٹھے ہیں۔ کیوں بھئی مُلّا جی؟ غلام اور لونڈیوں کے متعلق جو کچھ اس دریدہ دہن، عنان گسیختہ گستاخ نے کہا ہے وہ درست ہے یا شریعت پر بہتان ہے؟

میں نے مسکرا کر کہا کہ ہے تو درست!

ارشد اور حامد بیک زبان: کیا کہا آپ نے؟

میں: یہی کہ فیضی صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔

ارشد: یعنی شریعت کا حکم ہے کہ دشمن کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جائے اور پھر انہیں بلا نکاح۔ اور بلا تعداد جتنی جی چاہے گھروں میں ڈال لیا جائے۔

"اور جب کسی سے جی بھر جائے تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ بھی دیا جائے" فیضی نے نہایت طنز آمیز لہجہ میں کہا۔

ارشد: بس بھئی! میں اس سے زیادہ سن نہیں سکتا۔

فیضی: آپ کے نہ سننے سے شریعت بدل جائے گی کیا؟

ارشد: تو کیا یہ کچھ قرآن میں لکھا ہے جو بدلا نہیں جا سکتا؟

فیضی: یہ شریعت میں لکھا ہے۔

ارشد: شریعت کہتے کسے ہیں!

فیضی: جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، اسے شریعت کہتے ہیں۔

حامد: یعنی؟

فیضی: یعنی یہ کہ آپ کے اسلاف میں سے جو فیصلہ کسی نے کر دیا اس کا نام شریعت ہے۔ وہ اب کسی کے بدلنے سے بدل نہیں سکتا!

حامد: خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو؟

فیضی: وہ غلط ہو ہی نہیں سکتا۔

حامد: کیوں؟

فیضی: اس لئے کہ آپ کے اسلاف غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ غلطی بھی کر سکتے تھے سخت گستاخی ہے۔

حامد: لیکن اگر ان کا کوئی فیصلہ صریحاً قرآن کے خلاف ہو تو۔

فیضی: تو بھی یہی سمجھنا چاہئے کہ وہ بالکل صحیح ہے اسلئے کہ قرآن کو جیسا وہ سمجھ سکتے تھے تم نہیں سمجھ سکتے!

ارشد: تو گویا اب ہمارے لئے قرآن بے بیکار ہو گیا؟ ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے؟

فیضی: جی ہاں۔ آپ نہیں سمجھ سکتے۔ جتنا کچھ قرآن سمجھا جا سکتا تھا سمجھا جا چکا۔ اب آپ اس سے الگ ہٹ کر کچھ اور نہیں سمجھ سکتے!

حامد: یعنی ہماری عقل، فہم، علم سب بیکار ہیں؟

فیضی: بیکار ہی نہیں عقل و بصیرت سے کام لینے والوں کو مخبوط الحواس قرار دیا جاتا اور ملحد و بے دین بتایا جاتا ہے۔

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ریڈیو سے خبریں نشر ہونے لگیں۔ ایک خبر میں یہ بتایا گیا کہ آج مجلس آئین ساز نے پندرہ منٹ میں آئین کی سات دفعات منظور کر لیں۔ اس پر فیضی نے اس زور سے قہقہہ مارا کہ خبروں کی لہریں اس کے طوفان میں گم ہو گئیں۔ جب فضا میں ذرا سکوت ہوا تو اس نے اتنی ہی بلند آواز میں کہا "یہ ہے وہ آئین جس کے متعلق امریکہ تک میں ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا کہ وہ بے مثل و بے نظیر آئین ہوگا۔ اور جب اعتراض کیا گیا تھا کہ اس کی تدوین میں اسقدر دیر کیوں ہو رہی ہے تو نہایت فخر و مباہات سے فرمایا گیا تھا کہ یہ آئین ایک اسلامی مملکت کا آئین ہے۔ عام انسانی مملکتوں کا آئین نہیں کہ جس طرح مناسب سمجھا مرتب کر لیا۔ اس آئین کو اسلام کے غیر متبدل اصولوں کے فریم کے اندر تشکل ہونا ہے۔ اسلئے اسے یونہی نہیں بنایا جا سکتا۔ ہماری مجلس آئین ساز عام کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلیوں جیسی نہیں۔ یہ تو ایک لیبارٹری ہے جس میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ اسلام دنیا کو کس طرح ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جس کے بغیر انسانی زندگی کے مسائل کا حل ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے ....."

حامد نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ اسی لئے تو انھوں نے اوبجکٹیو ریزولیوشن میں یہ لکھا تھا کہ ہمارا آئین "کتاب و سنت" کے تابع رہے گا۔

فیضی: جی ہاں۔ اور یہ ہیں ناں وہ مفتیانِ عظام جو اب اسمبلی میں بیٹھے اس کا فیصلہ فرما رہے ہیں کہ کتاب و سنت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور ہمارا آئین کس طرح اس کے مطابق ہوگا!

ارشد: میرا تو خیال ہے کہ پاکستان میں ایک ہی شخص اس کا اہل تھا کہ وہ ہمیں صحیح اسلامی آئین مرتب کر کے دیدیتا یعنی مولانا مودودی صاحب۔

فیضی: لیکن اسے تو چودہ سال تک کے لئے کاٹھ مار کر رکھدیا گیا ہے۔

ارشد: میں اس پوزیشن میں تو نہیں ہوں کہ مودودی صاحب کی سزا کے متعلق کوئی رائے ظاہر کر سکوں۔ لیکن مجھے اس کا بڑا قلق ہے کہ ہم ایسے وقت میں اس شخص کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ گئے جب کہ ہمارے مستقبل کا سوال زیرِ غور تھا۔ میں تو

سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت تھی جو اس نے اس قسم کا روشن خیال عالم پاکستان میں پیدا کر دیا۔

میں اس بحث کو خاموشی سے سن رہا تھا لیکن اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے ارشد سے کہا کہ کیا آپ نے مودودی صاحب کے خیالات اور معتقدات کا مطالعہ کیا ہے جس کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ نہایت روشن خیال عالم ہیں۔

ارشد: نہیں۔ میں نے خود تو مطالعہ نہیں کیا۔ لیکن ہمارے ہاں ایک اور افسر ہیں جنھیں اس کا جنون ہے۔ وہ دن رات انہی کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان سے میں نے جو کچھ سنا ہے اس سے میں تو اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ واقعی بڑے روشن خیال اور ماڈرن عالم ہیں اور اگر آئین سازی کا کام ان کے ہاتھ میں دیدیا جاتا تو وہ ایسا دستور بنا دیتے جو کتاب و سنت کے بھی مطابق ہوتا اور ان لغویتوں سے بھی پاک ہوتا جنھیں عام طور پر اسلام کہہ کر پیش کیا جاتا ہے اور جنھیں ہم کسی طرح بھی دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔

میں: مثلاً کونسی لغویتیں؟

ارشد: تم کیا نہیں جانتے؟ اسی قسم کی لغویتیں جن کا ذکر ابھی ابھی یہاں ہو رہا تھا اور جن کے متعلق فیضی صاحب کہتے تھے کہ وہ سب ہماری شریعت میں موجود ہیں اور تم بھی ان کی تائید کرتے تھے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ارشد بھائی! غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ مودودی صاحب اسی شریعت کے علمبردار ہیں جس میں وہ سب کچھ موجود ہے جسے آپ "لغویتیں" قرار دے رہے ہیں!

حامد: کیا کہا آپ نے؟

میں: میں نے یہی کہا کہ مودودی صاحب اسی شریعت کے علمبردار ہیں جس میں وہ سب کچھ موجود ہے جسے آپ "لغویتیں" قرار دے رہے ہیں۔

ارشد: مودودی صاحب؟

میں: جی ہاں۔ مودودی صاحب

ارشد: یہ بات میری لئے بالکل نئی ہے۔

حامد: اور ناقابلِ تسلیم سی بھی!

میں: نہیں بھائی! نہ یہ نئی ہے اور نہ ہی ناقابلِ تسلیم۔ ابھی دیکھئے۔

یہ کہہ کر میں ایک الماری کی طرف بڑھا۔ اور فیضی نے پکارا کہ لو بھئی! چلے مُلّا جی پھر اسی سمندر میں ڈوبنے۔ یا مظہر العجائب! وہ ابھی فقرہ پورا نہ کرنے پایا تھا کہ میں دو تین کتابیں نکال کر پھر اپنی جگہ پر آبیٹھا۔

میں نے ارشد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے سلسلۂ کلام کا آغاز مسجد کے مُلّا کے اس وعظ سے کیا تھا جس نے معراج کے متعلق وہ کچھ کہا تھا جس پر آپ اس قدر تلملا اٹھے تھے۔ یہ ہے مودودی صاحب کے رسالہ ترجمان القرآن کا اگست ۱۹۵۱ء کا پرچہ۔ اس میں مودودی صاحب کی ایک ریڈیو کی تقریر درج ہے جس میں انھوں نے معراج کے متعلق گفتگو فرمائی ہے۔ اسمیں وہ فرماتے ہیں:

> حضرت محمدؐ کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے ۱۲ سال گذر چکے تھے۔ آپ حرم کعبہ میں سو رہے تھے کہ یکایک جبرئیل فرشتے نے آپ کو آکر جگایا۔ نیم خفتہ اور نیم بیدار حالت میں اٹھا کر زمزم کے پاس لیگئے۔ سینہ چاک کیا۔ زمزم کے پانی سے اسے دھویا۔۔۔۔

اس کے بعد آپ کو سواری کیلئے ایک جانور پیش کیا جس کا قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ جب وہ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا۔ جبریل نے تھپکی دی اور کہا۔ دیکھ کیا کرتا ہے۔ . . . پھر آپ اس پر سوار ہوئے . . . بیت المقدس پہنچکر آپ براق سے اتر گئے اور اسے اسی مقام پر باندھ دیا . . . اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبرئیل اس کے ذریعے سے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔

میں اتنا پڑھنے پایا تھا کہ ارشد صاحب نے فرطِ حیرت سے رسالہ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور خود پڑھنے لگ گئے۔ وہ خاموشی سے پڑھتے جاتے تھے لیکن بعض بعض فقرے ان کے منہ سے بے ساختہ اونچی آواز سے نکل پڑتے تھے۔ مثلاً

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں . . . پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں . . . ایک جگہ دیکھا کہ پتھر میں ذرا سا شگاف ہے اس میں سے ایک موٹا سا بیل نکل آیا۔ پھر وہ بیل اسی شگاف میں جانے کی کوشش کرنے لگا لیکن نہ جا سکا . . . پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جو اپنا اپنا گوشت کاٹ کر کھا رہے ہیں . . . کچھ لوگ آگ کھا رہے ہیں . . . کچھ عورتوں کو دیکھا جو اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔

اس کے بعد ارشد نے وہ پچاس نمازوں والا قصہ بھی اسی پرچہ سے پڑھ کر سنایا۔ حامد یہ کچھ سن رہا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی ارشد کی طرف اور کبھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔

ارشد نے مضمون ختم کیا تو رسالہ کو ایک طرف رکھ کر بڑے تعجب انگیز اور افسوسناک لہجہ میں کہا ـــــ یہ ہیں مودودی صاحب!

میں: جی ہاں۔ یہی ہیں مودودی صاحب جنھیں آپ اس قدر روشن خیال عالم قرار دے رہے تھے۔

حامد: مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے خواب میں یہ باتیں سن رہا ہوں۔

ارشد: (میری طرف مخاطب ہو کر)۔ اور وہ مرتد کی سزا کے متعلق کیا فرماتے ہیں مودودی صاحب؟

میں: اس کے متعلق تو ان کی ایک الگ کتاب موجود ہے جسکا عنوان ہے "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں"۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

یہ بات اسلامی قانون کے کسی واقف کار آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام میں اس شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف پلٹ جائے۔ (ص)

اس کے بعد ارشاد ہے:۔

ذرائع معلومات کی کمی کی وجہ سے جن لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ہے کہ شاید اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہ ہو اور بعد کے مولویوں نے یہ چیز اپنی طرف سے اس دین میں بڑھا دی ہو ان کا اطمینان دلانے کیلئے میں مختصراً اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔ (ص۱۳)

حامد: لیکن یہ لوگ پھر اس آیت کا کیا مطلب لیتے ہیں جس میں لکھا ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔

میں: سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:

لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کیلئے مجبور نہیں کرتے . . . مگر جسے آکر واپس جانا ہو اسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کیلئے کھلا ہوا نہیں ہے۔ لہٰذا آتے ہو تو یہ فیصلہ کر کے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے ورنہ براہ کرم آؤ ہی نہیں۔ (ص۵۲)

حامد: لیکن جو شخص اپنی مرضی سے اسلام کے دروازے کے اندر نہ آئے بلکہ وہ پیدا ہی مسلمانوں کے گھر میں ہو تو اس کے متعلق کیا حکم ہے۔

میں: وہی قتل کا حکم! اور کیا؟ اعتبار نہ آئے تو سن لیجئے۔ ارشاد ہے:

مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہی سمجھی جائے گی اور قانونِ اسلام کی طرف سے ان کیلئے ارتداد کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا۔ اگر ان میں سے کوئی اسلام سے پھر گیا تو وہ بھی اسی طرح قتل کا مستحق ہوگا جس طرح وہ شخص جس نے کفر سے اسلام کی طرف آکر پھر کفر کا راستہ اختیار کیا ہو۔ (ص۹)

ارشد: اس رسالہ کو بھی مجھے دیدو۔

حامد: اور وہ جو غلاموں اور لونڈیوں کی بات تھی تو اس کے متعلق بھی انھوں نے اسی قسم کے گل کھلائے ہیں؟

ارشد: اس زمانہ میں ان باتوں کو کوئی نہیں مانتا۔

میں: کوئی اور مانے یا نہ مانے۔ مودودی صاحب کے پیش کردہ نظامِ شریعت میں تو یہی حکم ہے کہ دشمن کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بناؤ۔

ارشد: کیا واقعی؟

میں: یہ ہے مودودی صاحب کی تفسیرِ قرآن کریم (جس کا نام ہے تفہیم القرآن) وہ اس میں فرماتے ہیں۔

حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہا کردے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرلے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں، اور چاہے تو انھیں سپاہیوں میں تقسیم کردے اور سپاہی انھیں اپنے استعمال میں لائیں۔ (ص۳۲۰)

حامد: کیا کہا آپ نے؟ مسلمان سپاہی دشمن کی عورتوں کو اپنے استعمال میں لے آئیں؟

میں: جی ہاں! اپنے استعمال میں لے آئیں۔ بلا نکاح۔

حامد: بلا نکاح!

میں: جی ہاں۔ بلا نکاح۔ مودودی صاحب (اپنی کتاب تفہیمات حصہ دوم) میں فرماتے ہیں کہ بلا نکاح استعمال میں لانے میں جو کراہت نظر آتی ہے وہ محض ایک وہمی کراہت ہے (ص۳۱۵)

ارشد: کس تعداد تک؟

میں: بلا تعداد۔ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ

لونڈیوں کے تمتع کے لئے تعداد کی قید اسلئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ ص۳۲۴)

حامد: تو ایک آدمی اتنی عورتوں کو کب تک رکھ سکتا ہے؟

میں: جب تک رکھ سکتا ہے رکھے۔ اس کے بعد کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے۔

ارشد: فروخت کردے؟

میں: جی ہاں۔ فروخت کردے۔ مودودی) صاحب فرماتے ہیں:

اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنوں میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لیکر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ (ص ۳۲۳)

حامد: خدا کے لئے اس سلسلہ کو بند کر دیجئے۔ میں اس سے زیادہ سن نہیں سکتا۔ توبہ۔ توبہ۔ استغفراللہ۔ اگر غیر مسلم یہ کچھ سن پائیں تو ہمارے متعلق کیا کہیں۔ ہم تو دنیا میں منہ دکھانے کے بھی قابل نہ رہیں۔

ارشد: ذرا سنو حامد۔ (میری طرف مخاطب ہوکر) لیکن ان باتوں کی کوئی سند اور دلیل؟

میں: سند اور دلیل یہ کہ ہمارے اسلاف سے یہ کچھ اسی طرح چلا آرہا ہے۔ اگلے دنوں یہ سوال زیر غور تھا کہ ہماری شریعت یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے جو محروم کر دیتی ہے تو اس کی سند کیا ہے۔ مودودی صاحب نے اس باب میں تحریر فرمایا تھا کہ

اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی صریح حکم ایسا نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت خلف سے سلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے

(ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۵۲ء)

اور جن لوگوں نے قرآن کی رو سے ثابت کیا تھا کہ یہ فیصلہ غلط ہے ان کے متعلق مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ

اس قسم کے خبطیوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے۔ (ترجمان القرآن۔ بابت جون جولائی ۱۹۵۲ء)

یہ ہے مودودی صاحب کے علم اور ان کی روشن خیالی کا حال۔ اور یہ ہے نمونہ اس نظام کا جسے وہ یہاں نافذ فرمانا چاہتے ہیں۔

فیضی اس تمام دوران میں آنکھیں بند کئے آرام کرسی پر لیٹے سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا چلا گیا۔ اس کی عادت تھی کہ جب اس کے سینے میں جذبات تلاطم خیز ہوں تو وہ بے تحاشا سگریٹ پیتا تھا۔ جب میں اس مقام تک پہنچا تو وہ آرام کرسی سے اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا کہ

فیضی:۔ اسے چھوڑو کہ مودودی کس قسم کا عالم ہے اور اس کا نظامِ شریعت کیا ہے؟ تم اس سے تو متفق ہو گے کہ وہ ان ڈاکوؤں کے گروہ سے منصب اور اقتدار کی کنجیاں چھیننا چاہتا ہے جسے یہ اپنے باپ دادا کی وراثت بنائے بیٹھے ہیں۔ اس کا یہ جہاد اس کی سینکڑوں کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر دیتا ہے۔ میں اس کی ایک عالم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک انقلابی کی حیثیت سے قدر کرتا ہوں۔ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ وہ جو مذہب کے معاملہ میں اس قسم کی باتیں کہتا رہتا ہے تو محض اس لئے کہ عام مسلمان اس کے ساتھ رہیں۔ ورنہ اس جیسا سمجھدار آدمی کبھی اس قسم کی لغویتوں کو دل سے نہیں مان سکتا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جہاں وہ ایک طرف اس قسم کی باتیں کہتا ہے اس کے ساتھ ہی دوسری طرف توہم پرستی، تنگ نظری، ملائیت وغیرہ کی تردید بھی کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا میرا خیال یہ ہے کہ اس نے اس چیز کو اپنے مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ اور میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔ "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے"۔

ارشد:۔ میں اس سے متفق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ مودودی صاحب ایمانداری سے ان چیزوں کو صحیح سمجھتے ہیں۔ وہ انہیں بطور سیاسی

حربہ کے استعمال نہیں کرتے۔

میں: بہرحال، بات دو صورتوں سے خالی نہ ہوئی۔ اگر فیضی صاحب ٹھیک کہتے ہیں تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جو شخص آج مذہب جیسی مقدس چیز کو اپنے مقصد کے حصول کیلئے دیدہ و دانستہ بطور ایک حربہ کے استعمال کرنے میں کچھ جھجک محسوس نہیں کرتا اس کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کل کو جب اقتدار اس کے ہاتھ میں آجائے گا تو وہ کیا کچھ نہیں کرے گا۔ ہماری سب سے بڑی بھول یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص کسی ایسے آدمی یا ادارے کے خلاف اٹھتا ہے جسے ہم اچھا نہیں سمجھتے تو ہم اس کی ہر حرکت کو جائز بلکہ مستحسن قرار دیتے چلے جاتے ہیں۔ محض اس لئے کہ اس سے ہمارے حریف کو زک پہنچتی ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ جو شخص اس قسم کا کیریکٹر رکھتا ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے ہر قسم کا حربہ استعمال کر لیتا ہے، اس کے ہاتھ میں قوت کی تلوار دیدینا کسقدر خطرناک ہے۔

اور اگر ارشد صاحب کا خیال صحیح ہے تو پھر آپ یہ سوچ لیجئے کہ اگر مودودی صاحب برسر اقتدار آ گئے تو وہ نظام کس قسم کا ہوگا جسے وہ نظام شریعت کے نام سے ملک میں قانون بنا کر رائج کر دیں گے۔ ذرا اس پر بھی غور کر لیجئے گا کہ اُسوقت اِن کے موجودہ معتقدات ملک کے قانون کی حیثیت لے لیں گے اور جس انداز سے آپ آج ان پر تنقید کر رہے ہیں، اس وقت اس قسم کی تنقید، حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن قرار دی جائے گی۔ حکومت ہی کے خلاف ایجی ٹیشن نہیں، بلکہ "خدا اور رسول" کے خلاف بغاوت۔ اس لئے کہ یہ مخالفت ہوگی اس شریعت کی جسے "خدا اور رسول" کا حکم قرار دیکر نافذ کیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر، اسوقت مودودی صاحب کے کسی عقیدہ کے خلاف عقیدہ رکھنا یا ان کے کسی فیصلہ کے خلاف لب کشائی کرنا "خدا اور رسول" کی معصیت اور اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت ہوگی۔

حامد: تو کیا اسوقت حکم صرف مودودی صاحب ہی کا چلیگا؟

میں: جی ہاں! صرف مودودی صاحب کا۔

ارشد: وہ کیسے؟

میں:- وہ ایسے کہ

پاکستان کا آئین اور قانون کتاب و سنت (قرآن اور حدیث) کے مطابق ہوگا۔

مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن میں صرف اصول دیئے ہیں۔ ان اصولوں کے تفصیلی احکام احادیثِ رسول اللہؐ کے اندر ہیں۔ لہٰذا، خدا اور رسول کی اطاعت کے معنی ہیں احادیث رسول اللہؐ کی اطاعت کرنا۔

لیکن۔ انھوں نے کہا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں میں غلط احادیث بھی ہیں اور صحیح احادیث بھی۔ نیز بعض امور ایسے بھی سامنے آ سکتے ہیں جن کے متعلق ان احادیث میں کچھ نہیں کہا گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ کونسی احادیث صحیح ہیں اور کونسی غلط۔ نیز یہ کہ جن امور کے متعلق احادیث خاموش ہیں ان کی بابت کیسے پتہ چلے کہ شریعت کا حکم کیا ہے۔

اس کے متعلق مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ بات ایک مزاج شناسِ رسول ہی بتا سکتا ہے کہ احادیث کے ان مجموعوں میں صحیح احادیث

کون کون سی ہیں۔ نیز جن امور میں احادیث خاموش ہیں ان کی بابت بھی وہی کہہ سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ آج موجود ہوتے تو وہ اس باب میں کیا ارشاد فرماتے۔

اس سے واضح ہے کہ "مزاج شناسِ رسول" کا فیصلہ خود خدا اور رسول کا فیصلہ قرار پاتا ہے اور اس کے فیصلے کی اطاعت، خدا اور رسول کی اطاعت۔

ارشد: لیکن یہ تو کسی "مزاج شناسِ رسول" کی بات ہے۔ آپ نے یہ کیسے تصور کر لیا کہ اس سے مراد خود مودودی صاحب ہیں۔

میں: جماعت اسلامی کے موجودہ امیر، امین احسن صاحب اصلاحی نے پنجاب کے فسادات کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے (عدالت میں) کہا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مزاج شناسِ رسول خود مودودی صاحب ہی ہیں۔

حامد: پھر تو معاملہ واقعی خطرناک ہے۔

(فیضی پھر آنکھیں بند کئے سگریٹ پیے جا رہا تھا۔ ارشد نے اسے آواز دی اور کہا)۔

ارشد: کیوں بھئی فیضی! تم پھر چپ ہو گئے۔ کچھ بولتے کیوں نہیں؟

فیضی: میرے نزدیک یہ سب بحثیں فضول ہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ جو شخص بھی ان چوروں سے حکومت کی کرسیاں چھیننے کیلئے اٹھے اس کا ہر اقدام جائز اور درست ہے۔ بقول اقبال

گر از دستِ تو کارے ناید آید گناہے ہم اگر با شد ثواب است

یہ محض نظری بحثیں ہیں کہ نظامِ شریعت کس قسم کا ہوگا اور اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہوگا۔ جیسا میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میرا پختہ یقین ہے کہ مودودی صاحب نے اسلامی نظام اور شرعی آئین کو محض ایک حربہ بنا رکھا ہے اس لئے کہ انھوں نے تو بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ اول تو پاکستان کا بننا ہی محال ہے اور اگر یہ بن بھی جائے تو اس کا ایک اسلامی مملکت بننا قطعاً ناممکن ہے۔ کیوں بھئی ملا جی، کچھ ایسے ہی تھے ناں ان کے الفاظ؟

میں: ہاں انھوں نے کہا تھا کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔

اور یہ بھی کہ

> بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک دفعہ غیر اسلامی نمونہ کا ہی سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم ہو جائے تو پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اسے ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۴۰ء)

فیضی:- یہ دیکھو۔ بات صاف ہے۔ جس شخص کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس میں کچھ دلچسپی ہی نہ ہو کہ پاکستان بنتا ہے یا نہیں۔ اور جس شخص کی بصیرت اسے یہ بتلائے کہ اس مملکت کا اسلامی بن جانا ممکنات سے ہے، اس کا سر پھرا ہے کہ وہ اس میں اسلامی نظام رائج کرنے کیلئے اس قدر مصیبتیں اٹھاتا پھرے؟ مودودی صاحب نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ہمارا مقصد حکومت کی کرسیاں حاصل کرنا ہے اور اسی کیلئے ان کی تمام جد وجہد ہے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے جو طریق کار انھوں نے اختیار کیا ہے اس کی داد تو تم بھی دوگے۔ میں تو محض اس لئے اس جماعت کی حمایت کرتا ہوں۔

میں: یہ ہے ارشد صاحب ساری بات۔ مودودی صاحب کی حمایت کرنے والے دو ہی قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ٹائپ جیسے (معاف فرمائیگا) آپ اور حامد صاحب۔ یعنی وہ لوگ جنھیں ذاتی معلومات کچھ نہیں۔ وہ محض دوسروں سے سن کر یہ خیال قائم کئے بیٹھے ہیں کہ مودودی صاحب ایک روشن خیال عالم ہیں جن کا مقصد اس قسم کا شرعی نظام نافذ کرنا ہے جس سے ہم ساری دنیا کی قوموں کی قیادت کے مستحق بن جائیں گے۔ اس باب میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی عدم معلومات کا یہ عالم ہے کہ اگلے دنوں کالج کا ایک طالب علم مجھ سے کہہ رہا تھا کہ یہ بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار جو ہزاروں ایکڑ زمین مفت میں سنبھالے بیٹھے ہیں اور غریب کاشتکاروں کی محنت پر عیش اڑا رہے ہیں۔ جب مودودی صاحب کا شرعی نظام رائج ہوگیا تو ان کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں گے۔ کیونکہ اس میں کسی کو اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اتنے اتنے رقبوں کے مالک بنے رہیں۔ اور وہ برخوردار اپنی ضد پہ اڑا رہا کہ وہ بالکل ٹھیک کہتا ہے، جب تک میں نے اسے خود مودودی صاحب کی کتاب (مسئلہ ملکیتِ زمین) سے یہ الفاظ پڑھ کر نہیں سنا دیئے کہ:-

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے ہیں بلا حد و نہایت رکھی جاسکتی ہیں۔ (ص۵۲)

ہاں! تو ایک تو یہ طبقہ ہے جو ذاتی طور پر کچھ نہیں جانتا لیکن مودودی صاحب کے پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر نہایت نیک نیتی سے سمجھے بیٹھا ہے کہ ان کا نظام شرعی فی الحقیقت اسلام کا ایک روشن اور تابناک مرقع ہوگا جس کے سامنے ساری دنیا کی گردنیں جھک جائیں گی۔ اور دوسرا طبقہ ہے فیضی صاحب جیسے لوگوں کا جو حُبِّ علیؓ نہیں بلکہ محض بغضِ معاویہؓ کی وجہ سے مودودی صاحب کے حامی ہیں۔ یعنی وہ ان کی تائید صرف اسلئے کرتے ہیں کہ یہ حکومت کو گالیاں دیتے ہیں اور برسرِ اقتدار طبقہ کے ہاتھ سے منصب و اقتدار چھیننا چاہتے ہیں۔ غلط کن، برسرِ اقتدار طبقہ کے ہاتھ سے اقتدار یقیناً چھین لینا چاہئے۔ بُری حکومت کو ضرور بدل دینا چاہئے۔ ہم میں سے کون ہے کہ جو موجودہ نظم و نسق کی خرابیوں کا مداح اور برسرِ اقتدار طبقہ کا قصیدہ خواں ہے؟ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جو لوگ موجودہ نظام کو الٹ کر اس کی جگہ دوسرا نظام مسلط کرنا چاہتے ہیں وہ نظام کس قسم کا ہے؟۔ وہ نظام، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں توہم پرستی، کورانہ تقلید، آمریت اور استبداد پر مبنی ہے۔ توہم پرستی ایسی کہ آپ کو ماننا پڑے گا کہ رسول اللہ واقعی ایک سیڑھی پر چڑھ کر آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے۔ تقلید ایسی کہ کسی مسئلہ کی تائید میں خواہ آپ کو قرآن و سنت سے کوئی سند بھی نہ ملے اسے اس لئے صحیح ماننا پڑیگا کہ وہ مسلمانوں میں صدیوں سے متواتر چلا آرہا ہے۔ آمریت ایسی کہ بڑے سے بڑے معاملہ کا فیصلہ ایک شخص کی نگاہ پر موقوف ہوگا

جسے مزاج شناس رسول قرار دیا جائے گا اور استبداد ایسا کہ اس کے فیصلے کے خلاف لب کشائی کرنا، خدا اور رسول کی معصیت اور اس سے انکار، اسلام سے خارج ہوجانے کے مرادف ہوگا جس کی سزا قتل ہوگی۔ اگر آپ اس قسم کے نظام کو پسند کرتے ہیں تو آپ شوق سے مودودی صاحب کی تائید کیجئے۔ ان کا ساتھ دیجئے۔ لیکن اگر آپ اس نظام کو اچھا نہیں سمجھتے تو پھر غور کیجئے کہ آپ دانستہ یا نادانستہ ایسے شخص یا ایسی جماعت کی حمایت کرکے جو اس قسم کا نظام مسلط کرنا چاہتی ہے کتنے بڑے خطرے کو مول لے رہے ہیں۔ اس وقت تو پھر بھی یہ ممکن ہے کہ ہم کوشش کریں تو کسی نہ کسی طرح صحیح اسلامی نظام رائج ہوجائے۔ لیکن اگر یہاں ایک دفعہ وہ نظام رائج ہوگیا جسے مودودی صاحب اور ان کے ہم نوا نظامِ شرعی کے نام سے آگے بڑھا رہے ہیں تو اس نظام کی جگہ صحیح اسلامی نظام کا لے آنا سخت مشکل ہوجائے گا۔ اسلئے کہ اس وقت عوام کی ساری تائید ان لوگوں کو حاصل ہوگی جنھیں وہ مذہبی پیشوا سمجھتے ہیں۔ باقی رہے ہمارے فیضی صاحب۔ سو جو حمایت حبِ علیؓ کی وجہ سے نہیں بلکہ علی البغضِ معاویہ ہو تو یہ خالص جذباتی روش ہے جس کا توڑ کوئی عقلی دلیل نہیں کرسکتی۔

فیضی:۔ اب اس لیکچر کو ختم بھی کروگے یا نہیں۔ ہم نے سینما بھی جانا ہے۔

اس طرح یہ دلچسپ صحبت ختم ہوگئی۔ ارشد صاحب یہ کہہ کر کتابیں ساتھ لے گئے کہ میں آج قائل ہوگیا کہ پروپیگنڈا کسی چیز کو کیا سے کیا کچھ بنا کر دکھا سکتا ہے۔

"فکری"

مقامِ حدیث

جلد اول و دوم

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ دین کے دو اجزاء ہیں ایک قرآن اور دوسری حدیث۔ قرآن کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ یہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو رسول اللہ نے خدا سے پاکر امت کو دیا۔ لیکن کیا حدیث کا بھی کوئی ایسا مجموعہ ہے جسے رسول اللہ نے امت کو دیا ہو؟ اگر حدیث بھی قرآن کی طرح دین کا جزو تھی تو رسول اللہ نے اس کا کوئی مستند مجموعہ امت کو کیوں نہ دیا؟ اگر ہم حدیث کو دین نہ مانیں تو پھر دین کے احکام پر عمل کیسے کریں کیونکہ قرآن میں تو ان احکام کی تفصیل درج نہیں؟

اس کتاب میں انہی سوالات پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ حدیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ یہ کیسے بنیں اور کس طرح ہم تک پہنچیں۔ روایات کے متعلق ایسا اہم ذخیرہ اور کہیں نہیں ملے گا۔ کتاب دو جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ ضخامت ہر جلد چار سو سے زیادہ قیمت مجلد مع گرد پوش فی جلد چار روپے (علاوہ محصول ڈاک) مکمل ہر دو جلد قیمت آٹھ روپے۔

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کراچی

"یتیم پوتے کی بحثیں دیکھکر ..."

"ابنِ آدم"

کچھ کم نصف صدی پہلے خواجہ احمد دین صاحب امرتسریؒ نے "یتیم پوتے" کا مسئلہ چھیڑا تھا جس کے بعد یہ مسئلہ چل پڑا کیونکہ دلائل کے لحاظ سے اس میں زور موجود تھا۔ خواجہ موصوف کے بعد مولانا اسلم جیراجپوری، مولانا غلام احمد پرویز اور مولانا تمنا پھلواروی نے اس مسئلے کو آسمان پر پہنچا دیا جس سے پاکستانی مجلس دستور ساز تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ دلیل کی جو قوت مجھے ان تحریروں میں نظر آئی وہ ان لوگوں کے دلائل میں نہ نظر آسکی جو یتیم پوتے کی محجوبیت کے قائل ہیں۔ بایں ہمہ بعض ضروری نکات اس پورے سلسلۂ بحث میں نہ دکھائی دیئے جن کو دیکھنے سننے کا میں متمنی تھا۔

طلوع اسلام سو بار اس دعوے کو دہرا چکا ہے کہ احادیث (نیز فقہ) کوئی وحی نہیں اور اس کا کوئی جزئیہ غیر متبدل قدر نہیں، بخلاف اس کے قرآن کا ہر کلیہ اور ہر جزئیہ ابدی اور غیر متبدل اقدار میں داخل ہے۔ طلوع اسلام اس دعوے پر اس سختی سے قائم ہے کہ اس کے اندر بھی بایں ہمہ روشن خیالی وہی جمود پیدا ہو گیا ہے[1] ——— ذرا اونچی سطح پر ——— جو حدیث وفقہ کو مستقل اقدار ماننے والوں کے اندر عرصے سے موجود ہے۔ اس کی بہت سی بحثوں کے بین السطور میں وہ متقدم (PROGRESSIVE) تصور جو ہم عرض کرنا چاہتے ہیں، جھلکتا ہے لیکن برملا ہنوز سامنے نہیں آیا ہے۔

حقیقت یوں ہے کہ قرآن پاک انسان کے تمام گوشہائے زندگی کے لئے کچھ ضابطے دیتا ہے، قانونی وسیاسی بھی اور اخلاقی وروحانی بھی۔ یہ سارے ضابطے اسے ہر ہر سمت سے گھیر کر ایک خاص مرکز ومقصد کی راہ پر لگا دیتے ہیں۔ ابدی اقدار (ETERNAL VALUES) دراصل یہی مرکز ومقصد ہوتا ہے۔ آگے چلنے سے پہلے یہاں رسول کا موقف بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ رسولؐ صدق اور صفا کی اس بلندترین چوٹی پر کھڑا ہوا ہوتا ہے جہاں اس کی نگاہیں ایک طرف ابدی وغیر متبدل اقدار پر گڑی ہوتی ہیں اور دوسری جانب دامنِ کوہ میں کھڑے ہونے والوں کی کمزوریوں، مجبوریوں اور ناچاریوں پر بھی جمی ہوتی ہیں۔ اقدارِ حیات کا جو عشق رسول کو بے چین کئے ہوئے ہوتا ہے اس کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی جست میں زمان ومکان کی حدود کو پھاند جائے مگر جو قوم اس کے حوالے کی جاتی ہے اس کی اکثریت ایسی بیمار ہوتی ہے کہ دو قدم چلنا بھی اس کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ رسول خود تو اسی بلند مقام پر ہوتا ہے جہاں ایک گری ہوئی بیمار وناتواں قوم کو لے جانا مقصود ہوتا ہے لیکن اس بیمار کی خاطر اسے کبھی کبھی خود نیچے اتر کر سہارا دینا پڑتا ہے۔

وحی صرف اتنا ہی نہیں کرتی کہ اعلیٰ اقدار کو دور سے دکھا کر الگ ہو جائے بلکہ اس کے دوش بدوش انسان اور بھی ... ایک بیت رسول کی

---

[1] استدراک ملاحظہ فرمایئے ... طلوع اسلام

زندگانی جو سب سے آگے آگے ہونے کے باوجود ہر ہر قدم پر اپنی ناتواں امت کو پلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے اور اسے پکڑ پکڑ کر آگے کھینچتا ہے۔ دوسرا احسان وحی کا یہ ہے کہ اس نے ابدی و مستقل اقدار تک پہنچنے کے لئے کچھ "عبوری ضابطے" بھی دیئے ہیں۔ قرآن کو ان عبوری ضابطوں سے خالی سمجھنا صحیح نہیں اور ان کو اصلی اقدار کی طرح ابدی و غیر متبدل فرض کر لینا بھی درست نہیں[1]۔

ایک دردمند طبیب کا اصل مقصد مریض کی تندرستی ہوتا ہے اور تندرستی آنے تک وہ جو دوائیں بھی استعمال کراتا ہے وہ عبوری دور ہی کی چیز ہوتی ہے۔ دوا کی کامیابی یہ نہیں کہ ہمیشہ مریض کے ساتھ چمٹی رہے اور کبھی جدا نہ ہو۔ اس کی اصل کامیابی یہ ہے کہ مریض کو تندرست کر کے خود الگ ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ ایک الگ گوشے میں محض اس لئے محفوظ رہے گی کہ اگر خدانخواستہ پھر اس کی ضرورت پڑ جائے تو وہ کام آ جائے اور اس طرح چند تجربوں کے بعد آخر کار وہ مریض کو تندرست کر کے خود غیر ضروری ہو جائے۔ قرآن پاک کی بھی بالکل یہی صورت ہے۔ وہ بیمار معاشرۂ انسانی کیلئے مختلف علاج بتاتا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ ہمیشہ یہ پروگرام اس کے ساتھ چپکا رہے بلکہ اس کی اصلی غرض یہ ہے کہ انسانیت اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ کر اس سے بے نیاز ہو جائے اور ان ضابطوں کی ضرورت نہ باقی رہے۔ وہ ضابطے ایک الگ گوشے میں محفوظ رہیں گے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ اپنے اندر کوئی ابدیت مقصود رکھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ شاید پھر کبھی انسانیت مائل بہ تنزل ہو جانے کی وجہ سے ان کی ضرورت محسوس کرے فطری قانونِ ارتقاء ایک مسلسل عمل کی طرح جاری ہے اور جاری رہے گا اور جب وہ انسانیت کو اصلی اقدار تک پہنچا چکے گا —— خواہ کروڑوں سال میں ہو —— تو وہ عبوری ضابطے اس لئے بے کار ہو جائیں گے کہ ان کا مقصد حاصل ہو گیا۔ اس وقت وہ ضابطے اپنی اصلی شکل میں ابدی نہیں رہیں گے بلکہ صرف اپنے نتیجہ و مآل کے لحاظ سے ابدی ہوں گے۔

ذرا جی کڑا کر کے چند مثالیں سن لیجئے:

(۱) قرآن نے حکم دیا کہ چور کا ہاتھ کاٹو اور زانی کو کوڑے لگاؤ۔ لیکن اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ دونوں جرم ختم ہو جائیں اور ان احکام کی ضرورت نہ رہے۔

(۲) قرآن نے لونڈی غلام کے بہت سے احکام دیئے ہیں لیکن مقصد اس رسم غلامی کی تصدیق (CONFIRM) کرنا نہیں بلکہ غرض یہ ہے کہ غلامی کی لعنت اور اس کے متعلق یہ تمام عبوری قوانین ختم ہو جائیں۔

(۳) قرآن نے بارہا کہا کہ محتاجوں کی امداد کرو، بھوکوں اور ننگوں کی روٹی کپڑے سے مدد کرو۔ لیکن مقصد یہ نہیں کہ ان نیکیوں کو جاری رکھنے کیلئے دنیا میں غربت اور فاقہ و محتاجی کو باقی رکھو بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ یہ ننگِ انسانیت داغ معاشرے کی پیشانی سے دور ہو جائیں۔

(۴) قرآن قتال پر بھی بار بار ابھارتا ہے لیکن مقصد خونریزی کی فراوانی نہیں بلکہ ایسے امن و امان کا قیام ہے جہاں جنگ کا نام نشان بھی نہ رہے۔

(۵) امیر و مامور وغیرہ کے بھی بہت سے احکام قرآن میں موجود ہیں لیکن حکومت وغیرہ کا قیام کوئی اسلامی مقصود نہیں۔ مقصد ایسے صالح معاشرے کا قیام ہے جس میں حکومت کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ خدا اور بندے کے درمیان کسی سیاسی و قانونی واسطے کا دباؤ نہ رہے۔ طاعتِ الٰہی براہِ راست ہو اور اقدارِ حیات کی طرف خوشدلانہ اور رضاکارانہ بے چینی کے ساتھ ارتقا ہوتا رہے۔

---

[1] اس پر [illegible] ملاحظہ کیجئے۔ (طلوع اسلام)

(۶) کہنا یہ ہے کہ قانونِ وراثت بھی اسی نوع کا ایک ضابطہ ہے۔

مجھے ایک محترم دوست کا ایک رسالہ پڑھ کر تعجب ہوا جس میں انھوں نے ملکیتِ زمین ثابت کرنے کیلئے قرآن سے کوئی دلیل نہیں دی۔ صرف ایک دلیل یہ مل سکی کہ اگر ملکیت نہ تسلیم کی جائے تو قرآن کا سارا قانونِ وراثت ختم ہو جاتا ہے۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔ گویا وہ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ:

اگر دنیا سے چوری اور زنا ختم ہو گئے تو قطع وجلد کی قرآنی سزا ختم ہو جائے گی۔

اگر غربت ومحتاجی کو باقی نہ رکھا گیا تو اعانتِ فقرا کے ثواب سے ہم سب محروم ہو جائیں گے۔

اگر لونڈی غلام کا رواج نہ رہا تو تحریرِ رقبہ کا حکم پیانہ ہو سکے گا۔ [1]

یہی صورت کچھ یتیم پوتے کی وراثت میں بھی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر خامہ فرسائی کرنے والوں میں کسی نے اس بات کی طرف اشارہ بھی نہیں فرمایا کہ قانونِ وراثت ملکیت کی تصدیق کرنے کیلئے نہیں بلکہ یہ ایک عبوری دور کیلئے ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ملکیت کے قصے کو رفتہ رفتہ ختم کر دیا جائے۔

قرآن کے یہ عبوری قوانین دراصل چند بلند اقدار کی طرف لے جاتے ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ کا نظام اسلئے ہے کہ مالی نظام "انفاقِ عفو" پر جا کر دم لے، لونڈی غلام کے ضوابط اس لئے ہیں کہ انجام کار کوئی کسی کا مملوک ومحکوم نہ رہے۔ اسی طرح ہر شعبۂ زندگی میں مختلف عبوری احکام چند اعلیٰ اقدار تک پہنچا کر خود الگ ہو جاتے ہیں اور پھر یہ سب اعلیٰ اقدار مل کر کسی اور بنیادی قدر کی طرف لیجاتے ہیں اور انجام کار یہ سب ایک آخری نصب العین ——— اللہ ——— میں جا کر گم ہو جاتے ہیں [2]۔ یہ حقیقت معلوم نہیں کیوں اب تک بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکی ہے۔

بہر حال یتیم پوتے کی ہی وراثت نہیں بلکہ پورا قانونِ وراثت بھی کوئی مستقل قدر نہیں۔ اس کی تہ میں اس سے بالاتر ایک اور قدر ہے جو اس کی روح اور اس کا مقصود ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشرے میں کوئی فرد بھی ننگا بھوکا نہ رہے اور کوئی فرد اپنے پاس ضرورت سے زیادہ نہ رکھے۔

ہم نے ابھی اوپر بتایا ہے کہ رسولؐ خود اعلیٰ اقدارِ مقصودہ کے مقام پر کھڑا ہوتا ہے اور نیچی سطح کے انسانوں کے لئے ان کی گوناگوں کمزوریوں کے پیشِ نظر کچھ عبوری قوانین بھی دیتا ہے اور ان کمزوریوں کے ساتھ اسے بھی چلنا پڑتا ہے۔ یہ ایک بڑی سخت ڈیوٹی ہے جو اس کے سپرد کی جاتی ہے۔ چند مثالیں اس کی بھی سنئے:

پیغمبرؐ نے قتال پر ابھارا لیکن خود اپنے ہاتھ سے غالباً ایک انسان کو بھی قتل نہیں کیا کیونکہ قتال ایک عبوری ضابطہ ہے اور مقصودِ اصلی خود رسولؐ کا عمل ہے جو عین منشائے قرآنی ہے۔

رسولؐ نے زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی لیکن اس کا جو سسٹم لوگوں کو بتایا اس پر خود کبھی عمل نہیں فرمایا۔ زکوٰۃ (ایک معین مقدارِ مال) تو وہ ادا کرے جس کے پاس مال جمع ہو۔ جس نے اپنے اوپر جمعِ مال ہی کو حرام کر لیا ہو اس کیلئے معین نظامِ زکوٰۃ کی پابندی کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے؟ وہ تو "انفاقِ عفو" سے بھی آگے ہوتا ہے جہاں "انفاقِ کل" کا جذبہ اسے بے چین کئے رہتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ نبیؐ نے ساری امت کو تقسیمِ ترکہ کا سبق دیا لیکن خود صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ لا نرث ولا نورث۔ ہم نہ وارث ہیں نہ مورث۔

---

[1] اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر انسان گناہ کرنا چھوڑ دے تو خدا کی صفت غفور رحیم بیکار ہو کر رہ جائے۔ (طلوع اسلام)

[2] آخری نصب العین کا نقطہ وضاحت چاہتا ہے۔ اس کے متعلق طلوع اسلام کے صفحات میں پہلے پہلے بحث ہو چکی ہے۔ (" ")

ہم نے بعض دوستوں کے مضامین دیکھے ہیں جن میں وہ لکھتے ہیں کہ حدیث لا نرث ولا نورث اس لئے غلط ہے کہ قرآن کے خلاف ہے حالانکہ حقیقت یوں ہے کہ یہ عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے۔ ہم خود ایسی تمام احادیث کو قابل رد سمجھتے ہیں جو قرآن کے خلاف ہوں لیکن خلافِ قرآن ہونے کا مطلب لفظوں کے خلاف ہونا نہیں بلکہ روح و معنی کے خلاف ہونا ہے۔ آیئے چند مثالیں اس کی بھی ملاحظہ فرمایئے۔

قرآن پاک میں مملوک کو کئی جگہ عبادٌ کہا گیا ہے۔ مثلاً وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم۔ اور الحر بالحر والعبد بالعبد۔ اسی طرح مالک کیلئے رب کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اذکرنی عند ربک ـــــ اس کے بالمقابل حضورؐ کا ارشاد ہے کہ:

لا یقولن احدکم عبدی وامتی ولا یقولن المملوک ربی وربتی، لیقل المالک فتای وفتاتی ولیقل المملوک سیدی وسیدتی فانکم المملوکون والرب اللہ تعالیٰ (رواہ الشیخان وابوداؤد عن ابی ہریرۃؓ)

تم میں سے کوئی شخص اپنے مملوک کو عبدوامہ (لونڈی غلام) نہ کہے اور نہ مملوک اپنے مالک کو رب وربتہ کہے۔ مالک فتی و فتاہ (BOY & MAID) کہے اور وہ سید وسیدہ (SIR, MADAME) کہے کیونکہ دراصل تم سب ہی مملوک ہو اور رب اللہ تعالیٰ ہے۔

ایک عمیق نگاہ رکھنے والا فوراً کہہ اٹھے گا کہ قرآن جسے عبدوامہ یا رب وربتہ کہتا ہے حدیث اس سے روکتی ہے لہٰذا یہ حدیث غلط ہے لیکن اس دعوے سے پہلے اسے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف نہیں جا رہی ہے بلکہ عین منشائے قرآنی کو پورا کر رہی ہے ـــــ اسی طرح ابوداؤد ونسائی میں عابد بن طرجیل سے ایک روایت ہے جس کا ہم صرف ترجمہ درج کرتے ہیں:

مجھے ایک بار قحط کا سامنا کرنا پڑا تو میں مدینے کے ایک باغ میں داخل ہوا۔ ایک خوشے کو مَل کر کھا لیا اور کچھ خوشے اپنے کپڑے میں رکھ لئے۔ اتنے میں باغ کا مالک آ پہنچا۔ اس نے مجھے مارا بھی اور میرا کپڑا بھی چھین لیا پھر مجھے حضورؐ کے پاس پکڑ کر لے گیا اور تمام واقعہ کہہ سنایا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ نادان تھا تم نے اسے کوئی تعلیم نہ دی، یہ بھوکا تھا، تم نے اسے کچھ کھلایا نہیں۔ پھر حضورؐ کے حکم سے اس نے مجھے کپڑا بھی واپس کر دیا اور ایک یا نصف وسق غلہ بھی دیا۔

اس روایت کو سن کر ایک کوتاہ نظر فوراً شور مچا دیگا کہ قرآن میں تو چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے اور اس حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے چور کا ہاتھ نہیں کٹوایا بلکہ الٹا اسے انعام دلوایا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ حدیث غلط ہے لیکن معترض کو پہلے اس پر بھی غور کر لینا چاہئے کہ قرآنی قانونِ قطع کا مقصد صرف ہاتھ پر ہاتھ کٹواتے چلے جانا نہیں بلکہ ایسے معاشرے کا قیام ہے جہاں نہ کوئی بھوکا ہو اور نہ چوری ہو۔ یہ حدیث اسی منشائے قرآنی کو پورا کر رہی ہے۔

مثالیں اور بھی بہت مل سکتی ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ حدیث لا نرث ولا نورث کو بھی اسی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ یہ فرمان عین اسی مقام نبوت سے صادر ہوا ہے جہاں ـــــ ان عبوری قوانین وراثت کے ذریعے ـــــ انسانیت کو لے جانا ہے یعنی زمین اور رزق کے تمام سرچشمے خدا کی ملک ہوں اور ان کا انتظام ایسے بندوں کے ہاتھ میں ہو جو ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق اس کا حق پہنچاتے رہیں۔ بلاشبہ یہ معاشی منزل ابھی دور ہے اور یہ اس وقت آئے گی جب افراد کے اندر جو جذبہ آج اپنی ذات یا اپنے خاندان کے لئے کمانے پر ابھارتا ہے اس سے زیادہ وہ اسے پورے معاشرۂ انسانی کے لئے کسبِ دولت پر ابھارے۔

بہرکیف یہ حدیث لا نرث ولا نورث قانونِ وراثت کی روح کو ہی بتاتی ہے۔ قانونِ وراثت ایک عبوری ضابطہ ہے اور یہ حدیث

اس کا آخری نتیجہ و منزل۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ایک طرف حدیث و فقہ کے ایک ایک جز کو غیر متبدل اقدار کا درجہ دیا جا رہا ہے اور دوسری جانب قرآن کے عبوری قوانین پر بھی اس انداز سے بحث کی جا رہی ہے کہ گویا یہی اصل اور ابدی اقدار ہیں۔ جمود دونوں ہی میں ہے۔ ایک میں ذرا بڑے پیمانے پر اور دوسرے میں کچھ چھوٹے پیمانے پر۔[1]

اسی طرح تمام غلط فہمیوں کا اصلی سبب وہ غلط فہمی ہے جو عرصہ دراز سے پورے اسلام کے متعلق قائم ہے۔ اسلام محض پابندیٔ قوانین کا نام نہیں۔ اسلامی احکام خواہ وہ نماز روزے کے ہوں یا وراثت و تعزیرات کے، یہ سب کے سب مل جل کر انسان کو ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں اور ایک خاص راستے پر لگا دیتے ہیں۔ یہی راستہ دراصل اسلام ہے جو درحقیقت صرف ایک رجحان (ATTITUDE) اور ایک اندازِ فکر و عمل ہے نہ کہ الفاظِ قانون کی پیروی یا اشکال و صور۔ اشکال و صور صرف ایک خاص رجحان پیدا کرنے کیلئے ہوتے ہیں خود مقصود نہیں ہوتے نماز فحشا و منکر سے بچنے کیلئے ہے، روزہ حصول تقویٰ کیلئے ہے، زکوٰۃ و انفاق صحیح تقسیم دولت کیلئے ہے۔ وھلم جرا۔ اگر یہ رجحانات نہیں پیدا ہوتے تو نری پابندیٔ احکام کو اسلام قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ اس مضمون کی وضاحت کیلئے ایک مثال سن لیجئے۔

فرض کیجئے ایک تحصیلدار کو کہیں بھیجا جاتا ہے اور اسے ہدایت یہ دی جاتی ہے کہ جس طرح ممکن ہو کاشتکاروں کو ابھارو، اٹھاؤ، بیدار کرو اور ان کا معیار بلند کرو۔ یہ ایک رجحان ہوا جو ایک خاص پالیسی کے طور پر اس میں ڈال دیا گیا۔ اب چارج لینے کے بعد اسے بیسیوں مواقع سے سابقہ کرنا پڑتا ہے۔ کہیں جلسے اور جلوس کی شرکت ہے، کہیں مالیے کی وصولی۔ کہیں فصل خصومات ہے اور کہیں تقریبات شادی و غم کی حاضری۔ غرض زندگی کے بیسیوں معاملات سامنے آتے ہیں اور وہ تحصیلدار ہر موقع پر اسی رجحان اور اسی روح کو پیش نظر رکھ کر الگ الگ انداز اختیار کرتا ہے۔ ہر عمل کی شکل الگ ہے لیکن سب میں روح ایک ہی ہوتی ہے یعنی کاشتکاروں کو بلند کرنا۔ بعینہٖ اسی طرح سمجھئے کہ قرآن انسانوں میں ایک خاص رجحان (ATTITUDE) پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہی رجحان روزے کے قانون میں ہے، یہی نماز میں، یہی قتال میں، یہی زکوٰۃ میں اور یہی قانون وراثت میں اور یہی سارے احکام قرآنی میں۔ اس رجحان کو توحید کہئے، تقویٰ کہئے، احسان کہئے، حسن و عشق کہئے، انسانیت کہئے، اقدار حیات کی محبت کہئے، جو جی چاہے کہہ لیجئے ہمیں سر دست اس سے بحث نہیں۔ کہنا فقط یہ ہے کہ اسلام دراصل وہی رجحان ہے جو ان سارے احکام کی مدد سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ صرف پوتے کو وراثت دلوانا اس کا مقصد نہیں اور اس پر اس انداز سے بحث کرنا بھی کہ گویا سارا اسلام اور ابدی قدر یہی ہے، درست نہیں۔

وہ دادا کیسا بدبخت ہے جو اپنے پوتے کو یتیم دیکھتے ہوئے بھی اس کے لئے کوئی وصیت نہیں کرتا اور اپنی زندگی میں اس کے لئے کوئی حصہ الگ نہیں کرتا۔ کیا از روئے قرآن اس بدبخت پر وصیت فرض نہیں؟ پھر وہ معاشرہ کتنا سنگدل ہے جس کے کچھ افراد اپنے بھتیجے کو ننگا بھوکا دیکھتے ہیں اور اس پر کوئی ترس نہیں کھاتے اور دوسرے افراد ایسے بے غیرت ہیں کہ اس ظالم چچا سے صرف اس لئے کچھ نہیں دلوا سکتے کہ ان کے خیال میں قانون وراثت کے اندر اس کی کوئی لفظی گنجائش موجود نہیں۔ قرآن کی کس آیت میں لکھا ہے کہ (تمہارے خیال میں) آیات وراثت میں جس کا ذکر نہ ہو اسے کچھ مت دو؟

---

[1] استدراک ملاحظہ کیجئے۔ (طلوع اسلام)

یہ ساری خرابیاں صرف اس لئے پیدا ہوئیں کہ قانونِ وراثت کو عبوری دور کی چیز نہ سمجھا گیا اور اس پر غور نہ کیا گیا کہ یہ نرا لفظی اور خشک قانون نہیں بلکہ اس کا ایک مقصد اور ایک روح بھی ہے اور وہی اصلی قدر ہے جہاں اس قانونِ وراثت کے عبوری زینوں سے لے جانا مقصود ہے۔ اس قانون سے اگر وہ رجحان ہی نہ پیدا ہو جو پیدا کرنا مقصود ہے تو یتیم پوتے کو حصہ دلوا کر بھی کون سا تیر مار لیا جائے گا؟

اس قانونِ وراثت سے جو آخری رجحان پیدا کرنا مقصود ہے وہ فقط یتیم پوتے کی وراثت نہیں بلکہ وہ فرمانِ مصطفوی ہے جو لا نرث ولا نورث کے بعد ہی موجود ہے اور وہ ہے ماترکنا صدقۃ۔ ہم جو کچھ چھوڑیں وہ اسٹیٹ کا ہے، کارِ خیر کیلئے ہے جس کا حقدار ہر ضرورتمند ہے۔ پیغمبر ہمارے معاشرۂ انسانی کو اسی مقام پر لانا چاہتا ہے جہاں رزق کے سارے سرچشمے مشترک ملکیت بن جائیں اور وہ سواءً للسائلین (تمام ضرورتمندوں کیلئے یکساں) ہوں۔ یہ فرمانِ رسول عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے اور یہاں آکر وراثت کے تمام عبوری قوانین اس طرح گم ہو جاتے ہیں جس طرح سمندر میں ٹپکنے والے قطرے۔

سچ پوچھئے تو اس طرح کے تمام عبوری قوانین پست انسانوں کے لئے ہوتے ہیں[1]۔ انھیں بھی بہر حال ساتھ لے کر چلنا ہے لیکن انھیں ساتھ لیکر چلنے کے معنی یہ نہیں کہ ان کو انہی عبوری دور کے زینوں میں الجھا کر رکھدیا جائے۔ غرضِ اصلی یہ ہے کہ اس سطح سے نکال کر دوسری بلند تر سطح پر لایا جائے جو اسی کا دوسرا ارتقائی زینہ ہے۔ یہ ارتقا کا ایک مسلسل اور غیر منقطع عمل ہے اور اس سے قرآن کی ابدیت خطرے میں نہیں پڑتی بلکہ منشائے قرآنی پورا ہی اس سے ہوتا ہے۔ کیا عجب کہ "نسخِ آیات" کا یہی مطلب ہو۔ انسان جب نیچی سطح سے بلند سطح کی طرف جاتا ہے تو پہلی سطح قدرۃً اس کیلئے منسوخ ہو جاتی ہے[2]۔ پہلی سطح کے مختلف انداز اس کیلئے "مثلہا" ہوتے ہیں اور دوسری سطح خیر منہا۔ پست انسانوں کیلئے عبوری قوانین بھی اسی وحی نے دیئے ہیں اور بلندی کی طرف جانے والوں کیلئے ارفع اقدار بھی اسی نے بخشے ہیں قرآن میں یہ دونوں ہی موجود ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایک کتاب ہے اور دوسری ام الکتاب۔ صرف کتاب میں الجھے رہنا کافی نہیں۔ ام الکتاب کی طرف بھی صعود کرتے رہنا چاہیئے۔

ہماری اس گفتگو کو وہ لوگ خصوصاً ناپسند کریں گے جو فقہی جزئیات تک کو ابدی اور غیر متبدل اقدار مان چکے ہیں لیکن ہمیں ان سے الجھنا نہیں۔ فطرت کا نہ رک سکنے والا ارتقا آخر کارواں کو وہیں لے آئیگا جہاں قرآن لانا چاہتا ہے اور اس نوع کے نسخِ آیات سے کسی کو مفر نہیں۔

استدراک

فاضل مقالہ نگار نے اپنے مضمون میں جس مرکزی خیال کو پیش کیا ہے، قارئینِ طلوعِ اسلام کیلئے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان کے سامنے یہ چیزیں ایک عرصے سے آرہی ہیں۔ مثلاً مارچ ۱۹۵۰ء کے طلوعِ اسلام میں اس موضوع پر گفتگو کرنے کے بعد کہ اسلام کے نظامِ ربوبیت میں ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ جب قرآن کریم میں وصیت کا حکم اور تقسیمِ وراثت تک کا قانون موجود ہے تو پھر کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی نظامِ اجتماعیہ میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں؟ اس کے جواب میں یہ

---

[1] یوں کہنا بہتر ہوگا کہ "جب معاشرہ ہنوز قرآن کی آخری منزل تک نہ پہنچا ہو"۔ [2] استدراک ملاحظہ فرمائیے۔ (طلوعِ اسلام)

لکھا گیا تھا کہ "قرآن ان حالات کو بھی سامنے رکھتا ہے جن میں ہنوز نظام اجتماعیہ اپنی مکمل شکل میں قائم نہ ہوا ہو۔۔۔۔ وصیت و میراث کے احکام اسی عبوری دور سے متعلق ہیں۔" (طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۵)

حقیقت یہ ہے کہ (اور اس کا اظہار بطور تحدیث نعمت کیا جاتا ہے کہ) یہ آواز اٹھی ہی طلوع اسلام کی طرف سے ہے کہ قرآن میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں اور نظام قرآنی کا مقصود تمام نوع انسانی کی ربوبیت ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ اس آواز کو طلوع اسلام نے اٹھایا ہے بلکہ یہ بھی کہ شاید یہ آواز قرنِ اول کے بعد مسلمانوں میں اٹھائی ہی پہلی مرتبہ گئی ہے۔ حالانکہ جس قرآن سے اس تصور کو لیا گیا ہے وہ مسلسل ہمارے ساتھ رہا ہے۔ طلوعِ اسلام اپنی اس سعادت پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ اندریں حالات یہ کہنا صحیح نہیں کہ طلوع اسلام نے وراثت کے احکام سے بحث کی لیکن یہ نہ بتایا کہ یہ احکام عبوری دور سے متعلق ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ فاضل مقالہ نگار اگر زیادہ نہیں تو کم از کم مارچ ۱۹۵۰ء کا پرچہ ہی دیکھ لیتے تو وہ اسے یہ طعن نہ دیتے کہ بایں ہمہ روشن خیالی اس میں بھی وہی جمود پیدا ہو گیا ہے اور یہ کہ متقدم تصورات اس کے بین السطور میں سے جھلکتے ہیں لیکن برملا سامنے نہیں آتے۔

(۲) مقالہ زیر نظر سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ محترم مقالہ نگار کا خیال ہے کہ چونکہ عبوری دور کے احکام محض عبوری دور کے احکام ہیں اسلئے ان کے متعلق کچھ بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال بھی درست نہیں۔ عبوری دور میں ہی احکام قرآنی احکام ہونگے اور اسوقت ان کی ویسی ہی اہمیت ہوگی جیسے قرآن کے دیگر احکام کی۔ اس دور میں بھی یہ ضرورت ہوگی کہ امت کو یہ بتایا جائے کہ اس دور میں قرآن انھیں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ یہ بات ایک مثال سے زیادہ واضح ہو سکیگی۔ قرآن میں وضو کا حکم ہے اور جب پانی نہ ملے تو تیمم ہے۔ لہٰذا تیمم کا حکم نہایت مختصر سے عرصہ کیلئے عبوری دور کا حکم ہے لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ قرآن کی رو سے تیمم کا صحیح منشا کیا ہے اور اسکی صورت کیا۔ جب ایسا چھوٹا سا عبوری دور کا حکم بھی اپنے مقام پر اپنی اہمیت رکھتا ہے تو پھر وراثت جیسے احکام عبوری دور میں کیوں اہمیت نہیں رکھیں گے؟ آج ہماری صورت یہ ہے کہ قرآن کی آخری منزل تو ایک طرف ہم ہنوز عبوری دور میں بھی نہیں پہنچے، عملی طور پر ہم نے اپنے سفر کیلئے پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا۔ طلوع اسلام، ملتِ اسلامیہ کو اس آخری منزل کی نشاندہی بھی کرتا جاتا ہے جہاں قرآن کاروانِ انسانیت کو لیجانا چاہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ عبوری دور کے قرآنی احکام سے بھی امت کو غافل نہیں رکھنا چاہتا۔ اس قسم کے احکام کی جو بحثیں آپ کو طلوع اسلام میں نظر آتی ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔

(۳) فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ جب قرآن کی آخری منزل آجائیگی تو عبوری دور سے متعلق آیات منسوخ ہو جائیں گی۔ اس مقصد کے لئے "منسوخ" کا لفظ اچھا نہیں ہے۔ یہ آیات اس وقت بھی منسوخ نہیں ہونگی ساقط العمل (SUSPEND) ہوں گی جس طرح پانی مل جانے کی صورت میں تیمم کا حکم منسوخ نہیں ہوتا، ساقط العمل ہوتا ہے یعنی جب تک پانی موجود تھا تیمم کا حکم پیچھے ہٹ گیا تھا اور وضو کا حکم آگے بڑھ آیا تھا۔ جب پانی نہ رہا تو وضو کا حکم پیچھے ہٹ گیا اور تیمم کا حکم آگے بڑھ آیا۔ اسی طرح جب قرآن کا نظام ربوبیت قائم ہو جائیگا تو وصیت، وراثت، قرض، بیع و شراء وغیرہ کے احکام پیچھے ہٹ جائیں گے۔ اگر یہ نظام پھر بکھر گیا (جیسا کہ قرن اول کے بعد ہوا) تو یہ احکام پھر نافذ العمل ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ معاشرہ ہمیشہ کیلئے قائم ہو گیا تو پھر ان عبوری دور کے احکام کے آگے بڑھنے کی نوبت نہیں آئیگی۔ ان تمام امور کی تشریح آپ کو محترم پرویز صاحب کی تصنیف "نظام ربوبیت" میں ملیگی جو ایک عرصہ سے اشاعت کیلئے تیار رکھی ہے لیکن گوناگوں موانع کے باعث ابھی تک شائع نہیں ہو سکی جس کا ہمیں بیحد رنج ہے۔ توقع ہے کہ اب یہ جلد ہی شائع ہو جائے گی۔

(طلوع اسلام)

غذا اور سائنس

(جناب محمد احسن جلیل صاحب ایم۔اے، ایل ایل بی)

[انسان دنیا میں آباد ہے اور اس کی طبعی زندگی کا انحصار اس غذا پر ہے جو کسی نہ کسی شکل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ زمین سے حاصل کی جاتی ہے۔ انسان کی آبادی بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ، کیا زمین میں اتنی استعداد ہے کہ وہ اسقدر بڑھنے والی آبادی کا پیٹ پال سکے؟ یہ وہ سوال تھا جس پر سب سے پہلے منظم طور پر اٹھارھویں صدی کے انگلستانی ماہر اقتصادیات مال تھوس (MALTHUS) نے غور کیا اور وہ اس لرزہ انگیز نتیجہ پر پہنچا کہ اگر انسان کی آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب یہ فقط بھوک ہی سے مرجائے گا۔ اس نے اپنے اس نظریہ کو اپنی کتاب (THE ESSAY ON PAPULATION) میں واضح کیا جس کا پہلا ایڈیشن ۱۷۹۸ء میں شائع ہوا۔ اس نظریہ نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا اور اس سے مترشح نتائج انسانوں کے لئے ہیبت کا موجب بن گئے۔ یہ نظریہ اسوقت سے آجتک ماہرین اقتصادیات کے نزدیک بحث و تمحیص کا مرکز بنا رہا ہے۔

اس خطرہ سے مدافعت کی ایک صورت یہ سوچی گئی کہ انسانی بچوں کی پیدائش کی روک تھام کی جائے۔ اسے برتھ کنٹرول یا ضبط تولید کہتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرا امکانی خیال ہے جس کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی آبادی کو کم کرنے کے بجائے زمین سے زیادہ سے زیادہ خوراک حاصل کرنے کے وسائل کیوں نہ اختیار کئے جائیں۔ زیر نظر مضمون میں جسے ہم دہلی سے شائع ہونے والے رسالہ "برہان" کی جون ۱۹۵۴ء کی اشاعت سے اخذ کر رہے ہیں یہ بتایا گیا ہے کہ ہمارے دور میں اس قسم کے سائنٹفک وسائل اختیار کئے جارہے ہیں جن سے خوراک کی مقدار بہت بڑھ گئی ہے اور اگر یہ وسائل اسی طرح آگے بڑھتے گئے تو انسان کیلئے بھوک سے مرجانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ اس مضمون کو ہم اس مقصد کے پیش نظر شائع کر رہے ہیں کہ یہ بتایا جائے کہ جو قومیں فطرت کے خزائن و ذخائر کی جستجو میں سائنٹفک طریق سے مصروف جدوجہد ہیں، فطرت انھیں کس طرح مالا مال کر رہی ہے۔ ان قوموں کا یہ عمل قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے جس نے بار بار اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے انسان کیلئے قانون کی زنجیروں میں باندھ دیا گیا ہے۔ دنیا کی جو قوم بھی اس قانون سے واقفیت حاصل کر کے تسخیر فطرت میں عملاً مصروف ہو جائے گی، فطرت کے خزانے اس کے سامنے کھل جائیں گے۔ خدا کی ربوبیت عامہ اپنے عطایا کے دروازے کسی پر بند نہیں کیا کرتی خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْجُوْرًا (۱۷/۲۰) البتہ جس مقام پر جا کر فرق پڑتا ہے وہ فطرت سے حاصل شدہ رزق کی تقسیم کا سوال ہے۔ قرآن اس رزق کو تمام نوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھنا چاہتا ہے۔

واضح رہے کہ برتھ کنٹرول کا مسئلہ اتنی سی بات سے حل نہیں ہو جاتا کہ ہم محنت کرنے سے خوراک زیادہ حاصل کر سکتے ہیں اسکے اور بھی کئی گوشے ہیں۔ مثلاً عورتوں اور بچوں کی صحت کا سوال، بچوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ، دوسری طرف جنسی تعلقات کا نازک مسئلہ، اور اس کے نفسیاتی اثرات۔ ہمارے پاس اس موضوع پر بہت سے استفسارات آرہے ہیں لیکن جب تک ہم ان تمام گوشوں کے متعلق پوری پوری معلومات بہم نہ پہنچالیں ہم اس اہم سوال پر قلم نہیں اٹھانا چاہتے۔ یوں کہنے کو تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

طلوع اسلام]

دنیا کی آبادی اوسطاً دو کروڑ فی سال یا ساٹھ ہزار فی دن کی رفتار سے بڑھ رہی ہے اور یہ مسئلہ کہ دنیا کی غذائی پیداوار موجودہ آبادی کیلئے کافی ہے یا نہیں، یا ہم میں بڑھتی ہوئی آبادی کیلئے غذائی پیداوار کو بھی نسبتاً بڑھانے کی صلاحیت ہے یا نہیں آج کل بہت وسیع پیمانے پر زیر بحث ہے۔ اس بحث میں حصہ لینے والوں میں سے ایک فرقہ (MALTHUS) کے پیروؤں کا ہے جن کا خیال ہے کہ دنیا غذائی پیداوار کی مناسبت سے زائد آباد ہے اور اگر اس بڑھتی ہوئی آبادی کا معقول انسداد نہ کیا گیا تو یقینی آبادی کا ایک حصہ بھوکوں مر جائے گا۔ اس قنوطی فرقے کا یہ بھی خیال ہے کہ دنیا کی غذائی پیداوار اس رفتار سے نہیں بڑھائی جا سکتی کہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ دے سکے لہذا ان کی یہ رائے ہے کہ غذائی بحران کا حل نہ صرف یہ ہے کہ آبادی کی تیز افزائش روکی جائے بلکہ آبادی کا زائد حصہ ہی ختم کر دیا جائے تاکہ بقیہ لوگ آرام و سکون سے زندگی گذار سکیں۔ اس کے برعکس دوسرا فرقہ رجائیوں کا ہے جس میں سائنسدان بھی شامل ہیں۔ ماہرین اقتصادیات و زراعت کا خیال ہے کہ موجودہ سائنس کی مدد سے انسان میں نیچر پر قابو پانے کی صلاحیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ دنیا نہ صرف موجودہ آبادی کا پیٹ بھر سکتی ہے بلکہ آنیوالی نسلوں کے لئے غذا کی بہتات کا یقین بھی دلا سکتی ہے

پروفیسر ڈڈلے اسٹیمپ (PROF. DUDLEY STAMP) اپنے ایک مضمون میں جو (RURAL INDIA) میں شائع ہوا ہے لکھتے ہیں "سائنس کی مدد سے اب ہم جہاں گھاس کی ایک پتی اگتی تھی وہاں دو اگانا، فی ایکڑ زیادہ پیداوار حاصل کرنا، مختلف کیڑے مکوڑوں اور نباتاتی امراض پر قابو پانا، فصل پکنے سے قبل اس کو مختلف چڑیوں، چوہوں اور چوپایوں سے بچانا اور زراعت کے جانوروں کو مختلف امراض سے محفوظ رکھنا سیکھ رہے ہیں مگر ہنوز سائنس نسلِ انسانی کی افزائش کا ساتھ نہیں دے رہی ہے"۔

یہ ہے سائنس کے کرشموں کا اعتراف جو کہ ایک عظیم ہستی نے اس بات کے متعلق کیا ہے جس کیلئے ہمارے آباواجداد اس طرح فخریہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ مگر اس اقتباس کے آخری جملہ سے ایک قسم کی قنوطیت اور مستقبل کے متعلق ایک خوف کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمیں یہی دیکھنا ہے کہ یہ خوف کہاں تک درست ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے حاصل کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم زراعت کے میدان میں سائنس کے اصولوں کی جانچ کریں اور نہ صرف اتنا ہی، بلکہ سائنس آئندہ کیا کر سکتی ہے اس کا بھی اندازہ لگائیں۔ ہمیں مختلف ترقی یافتہ ممالک کی اسکیموں کی جانچ کرنی ہوگی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ان سے مستقبل کے متعلق کیا کیا پیشین گوئیاں ہو سکتی ہیں۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں کہ مختلف ممالک میں زراعت کے میدان میں سائنس نے جو کچھ کیا ہے ہم اس کی مکمل فہرست بنائیں بلکہ چند اصولوں پر اور مستقبل کے امکانات پر ہی ہمارا غور کر لینا کافی ہے۔

چنانچہ مملکت روس میں نظریہ مالتھوز (MALTHUSIAN THEORY) کو پہلی مرتبہ غلط ثابت کیا گیا ہے اور وہاں اس کو عرصہ ہوا

لوگ بھول چکے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں جہاں شرح پیدائش تمام دیگر ممالک سے زیادہ ہے غذا کی پیداوار اس سے بھی کہیں زائد ہے۔ اس ملک میں لوگ مستقبل سے خوفزدہ نہیں ہیں لہٰذا وہاں بجائے بڑھتی ہوئی پیدائش کی رفتار کو روکنے کے ماؤں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کریں چنانچہ ایک مقررہ تعداد تک کسی ماں کے اگر بچے پیدا ہو جائیں تو اسے مدر ہیروئن (MOTHER HEROINE) کا خطاب ملتا ہے۔ علاوہ ازیں حکومت کی طرف سے بچوں کی تعداد کے مطابق ان کی امداد بھی کی جاتی ہے۔

روس میں اناج کی پیداوار ۱۹۱۸ء میں چھ کروڑ پچاس لاکھ ٹن تھی اور آج وہی پیداوار تقریباً گیارہ کروڑ پچاس لاکھ ٹن ہے اور یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ روس نہ صرف اپنی کل آبادی کا پیٹ بھرتا ہے بلکہ دیگر ممالک کو بھی اناج فروخت کرتا ہے۔

مگر یہ سب کیسے حاصل ہوا؟ محض سائنس کی مدد سے۔ نئی نباتاتی سائنس کا موجد (I.V. MICHURIN) جو روس کا سائنسداں ہے کہتا ہے کہ "ہم نیچر کی طرفداری کا انتظار نہیں کرسکتے ہمارا کام اس کو اپنی ضرورت کے مطابق موڑ لینا ہے۔" یہی وہ ذہنی کیفیت تھی جس نے نیچر کو روسی لوگوں کے سامنے جھکنے پر مجبور کردیا۔ (N. PLAVIL SCHIKOV) نے اپنے مضمون "OUTSTANDING DISCOV-ERIES IN AGRICULTURAL SCIENCE IN U.S.S.R." جو بمبئی کے ایک رسالے "AGRICULTURAL ECONOMIST" میں شائع ہوا تھا لکھا ہے "روس کی زراعتی سائنس جس نے پیداوار کے بڑھانے میں وہ مدد کی جو کبھی نہ سنی گئی تھی دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ سائنس ہے۔ ۔ ۔ روس کے کسان اور سائنسداں نیچر کی طرفداری کا انتظار نہیں کرتے اور نہ وہ ان کی خیرات پر بسر کرتے ہیں بلکہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں نیچر سے لے لیتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ نیچر سے مانگتے ہیں اور اسے اپنا سب کچھ دیدینے پر مجبور کردیتے ہیں۔ سرزمین روس میں نیچر پر قابو رکھا جاتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلیاں بھی کی جاتی ہیں" بے شبہ وہاں نیچر میں اس قدر تبدیلیاں کی گئی ہیں کہ نئے نئے قسم کے پودے اور نئے نئے قسم کے جانور جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے گئے تھے وہاں پیدا کئے جاتے ہیں۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہوا جب روسیوں نے میچورین اور لائسنکو (MICHURIN & LYSENKO) کے نظریات کو عملی جامہ پہنایا۔ انھوں نے سکھایا تھا کہ "انسان نئے پودے اور نئے جانور پیدا کرسکتا ہے اور اسے پیدا کرنے بھی چاہئیں بلکہ ان سے بھی بہتر جو قدرت نے پیدا کئے ہیں۔" آج کل سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد پچاس سے زائد پلانٹ فیکٹریوں (PLANT FACTORIES) میں انہی ناموران سائنس کے نظریات پر تحقیقات کرنے میں مشغول ہے اور انھیں عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ ان کی تحقیقات کی مدد سے آج روسی لوگ سنٹنرس (SENTNERS) فی ہیکٹر (HECTORE) گندم پیدا کر رہے ہیں۔ اس سے قبل گندم کی اتنی اچھی فصل کہیں نہیں سنی گئی تھی۔ پہلے اکثر فصلیں کہرے اور تمازت آفتاب سے خراب ہو جایا کرتی تھیں اور قدرت کے ان ہتھیاروں کا مقابلہ نہ کرپاتی تھیں مگر اب کچھ ایسی بھی فصلیں وہاں ہوتی ہیں جو ان چیزوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ مثلاً روسیوں نے ایک قسم کا گیہوں پیدا کیا ہے (جو گندم اور ایک گھاس کی ملاوٹ سے پیدا کیا جاتا ہے) جس کی فصلیں پہلی مرتبہ بونے کے بعد مسلسل تین سال تک ہوتی رہتی ہیں یا وہاں سیب کی ایک بیل ہوتی ہے جس کی شاخیں اوپر نہیں چڑھتیں بلکہ زمین پر ہی پھیلتی ہیں اور ان کو برف کی ایک موٹی تہ ڈھانک لیتی ہے اور اس طرح وہ موسم سرما کے کہرے سے محفوظ رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ایجادات ہیں مثلاً کئی نئی اقسام کے گلاب اور دیگر پھولوں کے پودے۔ نئی نئی اقسام کے ربر کے درخت اور رنگین روئی (COLOURED COTTON) علاوہ ازیں کچھ نئی اقسام کے جانور بھی پیدا کئے ہیں

جو مختلف مقامات اور مختلف آب و ہوا میں کارآمد ہیں۔ گایوں سے وہ لوگ ۱۶۲۶۲ لیٹرس (LETRES) دودھ نکال لیتے ہیں۔

بایں ہمہ جو کچھ اہل روس نے اب تک کیا وہ ان کے شاندار مستقبل کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ حال ہی میں حکومتِ روس نے ایک نئی اسکیم نیچر پر مزید قابو حاصل کرنے کے لئے پیش کی ہے۔ اس اسکیم میں قطع نظر کئی دیگر چیزوں کے پانچ آبپاشی کے ذرائع کی تعمیر ہے۔ ان پر برابر کام ہو رہا ہے اور ان سے بہت کچھ فائدہ بھی اٹھایا جا چکا ہے۔ ان عظیم تعمیرات کا ذکر ڈاکٹر ایس۔ ایم مینٹن (S.M. MENTON) (برطانیہ کے بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنسدان) نے روس کی سیاحت کے بعد کیا ہے۔ آیئے ہم بھی ان پر ایک نظر دوڑالیں۔

۱۔ ان میں سے ایک والگا ڈان کینال ہے (VOLGA DON CANAL) جس کی تکمیل جولائی ۱۹۵۲ء میں ہوئی ہے اور جس نے ماسکو کو "پانچ سمندروں کا ساحل" بنا دیا ہے۔ یہ ترسٹھ (۶۳) میل لمبی نہر جس میں کہ ۱۳ جہاز رانی کے باندھ، کئی زبردست ڈام (DAM) گھاٹ اور (TSIMLYANSKAYA) بجلی کا اسٹیشن (جو کہ ۱۲۵ میل لمبی اور ۲۵ میل چوڑی ایک مصنوعی جھیل پر واقع ہے) کل تین سال کے قلیل عرصہ میں مکمل ہوئی تھی۔ اگرچہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں مساوری (MISSOURI) پر واقع فورٹ پیکس ڈام (FORT PEXK DAM) کو دنیا کا سب سے بڑا ڈام تصور کیا جاتا تھا مگر (TSIMLYANSKAYA) پر وقوعہ ڈام اس سے دگنا بڑا ہے۔

۲۔ مین ترکمانیں کینال (MAIN TURKMANIAN) جو کہ ۶۳۰ میل لمبی ہوگی زیر تعمیر ہے اور یہ ۱۹۵۷ء تک مکمل ہو جائے گی۔ وسط ایشیا میں جمہوریت ترکمانی ۸۰ فیصدی صحرائے کاراکم (جو کہ دنیا کے سب سے بڑے ریگستانوں میں سے ہے) سے گھرا ہوا ہے۔ اس خطہ کی آب و ہوا گرم ہے اور وہاں پانی کی بہت قلت ہے لہٰذا بہت غیر آباد بھی ہے۔ صحرائے کاراکم کے درمیان سے نہر نکالنے میں وہاں کاشت کرنے کی صورت پیدا ہو سکے گی۔ اس نہر میں دریائے امو (AMU) کا پانی آئے گا۔ یہ نہر دنیا کی سب سے بڑی نہر ہوگی اور امید کی جاتی ہے کہ وہ اس ریگستانی علاقہ کو زرخیز بنا دے گی۔ صحرائے کاراکم کے تقریباً ۱۷ لاکھ ہکٹر (HECTORS) حصہ کی آبپاشی چراگاہ بنانے کے لئے کی جائے گی اور تیرہ لاکھ ہکٹر روئی کی پیداوار کے لئے۔ اس اسکیم کے ماتحت مستقبل قریب میں چھوٹی چھوٹی دیگر نہروں ڈام اور بجلی کے اسٹیشنوں کا ایک جال ہو جائے گا جو کہ اس عظیم ریگستان کو کاشتکاری کے لائق اور ایک اچھی چراگاہ بنا دے گا۔

(۳ و ۴) ان دو اسکیموں کے ذریعہ روسی دو زبردست بجلی کے اسٹیشن جن کے نام (STALINGRAD اور KUIBYSHEV اسٹیشن ہوں گے) تعمیر کئے جائیں گے۔ یہ دونوں اسٹیشن امریکہ کے گرانڈ کاؤلی (GRAND COULEE) (جو کہ موجودہ زمانے کا سب سے بڑا بجلی کا اسٹیشن ہے) سے کہیں بڑے ہوں گے۔ ان میں سے ایک ۱۹۵۵ء اور دوسرا ۱۹۵۶ء تک تیار ہو جائے گا۔ یہ دو کروڑ K.W.H. بجلی پیدا کریں گے اور ۴۰ لاکھ ہکٹر زمین کی آبپاشی کریں گے۔

(۵) پانچویں اسکیم، کریمیا کی نہروں کا ایک جال ہے جو تقریباً پچاس میل کی ہیں اور یہ نہریں ۳۳ لاکھ ہکٹر زمین کی آبپاشی کریں گی۔

یہ تمام بجلی کے اسٹیشن اندازاً بائیس ہزار K.W.H. سالانہ بجلی پیدا کریں گے۔ اتنی بجلی ڈنمارک، فن لینڈ، ہالینڈ، بلجیم اور سپین کے تمام اسٹیشن ملکر پیدا کرتے ہیں۔ ان نئی تعمیرات سے جتنی آبپاشی ہو سکے گی اس کے متعلق ڈاکٹر مینٹن (DR. MENTON) کہتے ہیں

"روس میں ۷۰۰ لاکھ ایکڑ زمین کی آبپاشی کی جائے گی جو کہ وادیٔ نیل کی آبپاشی شدہ خطہ سے نو گنا زائد ہے۔ یہ خطہ ۱۰ کروڑ انسانوں کیلئے کافی غذا پیدا کرے گا۔ کناڈا سے زیادہ گیہوں اور مصر و پاکستان سے زیادہ روئی یہاں پیدا ہوگی۔" اس خطہ کے کچھ حصوں میں گیہوں کی دو دو فصلیں ہر سال ہوا کریں گی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک اور اسکیم زیر غور ہے جس کے ذریعہ دریائے اوب (OB) اور دریائے یئسی (YENISIE) کے پانی کا رخ جنوب کی طرف موڑ دیا جائے گا۔ یہ پانی ۲۵۰۰ میل تک سفر کر کے وسط ایشیا کے ریگستان کو زرخیز خطوں میں تبدیل کر دے گا۔ ڈاکٹر بینٹن کہتے ہیں "یہ ۲۶۰ لاکھ ایکڑ زمین کو کاشت کے لائق بنا سکے گا اور ۸۷۰ لاکھ ایکڑ زمین چراگاہوں کے لئے ..... وسط ایشیا کے ممالک بجائے دو کروڑ کے اب بارہ کروڑ انسانوں کے لئے غذا پیدا کریں گے۔"

ان تمام حالات سے ہم کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں؟ یہی کہ مملکت روس پانچ دس سال کے اندر زائد بیس کروڑ انسانوں کے لئے غذا پیدا کرنے کا انتظام کر رہا ہے اور یہی کہ روس کل دنیا کی ایک رقبہ میں بڑھنے والی آبادی یعنی بیس کروڑ انسانوں کو غذا مہیا کر سکے گا۔ ان امید افزا حالات کے ہوتے ہوئے ایک قنوطی ہی مستقبل سے خوف زدہ ہو سکتا ہے۔

ایک وہ بھی زمانہ تھا جب پچاس میل لمبی نہر بنانا ۲۵ سال میں تیار ہوئی تھی اور روس میں اب ۶۳ میل لمبی والگا ڈان نہر مع ۱۲۵ میل لمبی اور ۲۵ میل چوڑی مصنوعی جھیل کے، صرف تین سال کے اندر تیار ہو گئی اور ۶۳۰ میل لمبی ترکمانین نہر سات سال کے اندر تیار ہو جائے گی۔ یہ ہیں موجودہ سائنس کے کرشمے۔ بغیر موجودہ سائنس کی امداد کے اتنے قلیل عرصہ میں اتنی بڑی تعمیرات کی تکمیل سوچی بھی نہیں جا سکتی تھیں سائنس کی مدد سے روسیوں نے اتنی زبردست زمین کھودنے والی مشین بنائی ہے جو سات ہزار سے دس ہزار مزدوروں کا کام دیتی ہے اور (SUCTION DRUDGE) اتنا کام کرتا ہے جتنا ۲۵ ہزار آدمی یا ۱۵ ہزار گھوڑے کر سکتے ہیں۔ انہی مشینوں کے ذریعہ روسیوں نے نیچر پر قابو پایا ہے تاکہ انسان کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

روس کے موجودہ پنج سالہ پلان (۱۹۵۵ - ۱۹۵۰) کے مطابق ۱۹۵۵ء میں ۱۹۵۰ء کے مقابلہ پر کل غلہ کی پیداوار ۴۰ سے ۵۰ فیصدی گوشت کی ۸۰ سے ۹۰ فیصدی، دودھ کی ۴۵ سے ۵۰ فیصدی مچھلی کی ۵۸ فی صدی مکھن کی ۷۲ فیصدی اور انڈے کی ۱۰۰ فیصدی بڑھ جائے گی۔ اور اس پانچ سال کے عرصہ میں قومی آمدنی ۶۰ فیصدی بڑھ جائے گی۔ سوچئے کہ اس رفتار سے موجودہ زمانے میں پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مالتھوز کا نظریہ اب بے کار معلوم ہوتا ہے۔ یہ حالات اس نظریہ کو جھٹلانے اور غلط ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس کو بالکل بھلا دیا جائے۔ سائنس نے دکھا دیا ہے کہ انسان نیچر کا غلام نہیں بلکہ آقا ہے۔

چین چند سال قبل قحط سالی کے لئے مشہور تھا اور ہزاروں انسان ہر سال بھوک کا شکار ہو جاتے تھے۔ اس ملک کو بہت سا غلہ درآمد کرنا پڑتا تھا۔ ہر سال سیلاب اور قحط اس پابندی سے آتے تھے کہ انھیں چین کے لئے ایک فطری اور عام چیز سمجھا جانے لگا تھا مگر ۱۹۴۹ء میں نئی حکومت کے قیام کے تین سال کے اندر ہی اندر وہاں کے حالات بالکل بدل گئے اور نئے چین میں غذا کی کمی کا کوئی سوال نہیں رہا۔ آج چین نہ صرف اپنی کافی بڑی آبادی کو غذا مہیا کر رہا ہے بلکہ دیگر ممالک کو بھی بھیجتا ہے۔ بالفرض ہم ۱۹۴۹ء کی

پیداوار کو ۱۰۰ مان لیں تو اس مناسبت سے ۱۹۵۱ء میں پیداوار ۱۲۸ ہو گئی تھی اور ۱۹۵۲ء میں ۱۴۰۔ اس طرح تین سال میں پیداوار ۴۰ فیصدی بڑھی۔ ۱۸۷۷ء کے بعد ۱۹۵۱ء میں یہ پہلا موقع تھا کہ چین کا توازنِ تجارت ملک کے حق میں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چین میں غلہ کی درآمد کی بجائے برآمد ہونے لگی۔ وہاں کی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۹ء میں ایک ہزار لاکھ مُو (مو ۱/۶ ایکڑ کی برابر ہوتا ہے) زمین سیلاب کے ہاتھوں تباہ ہو گئی تھی مگر ۱۹۵۲ء میں کل ۸۰ لاکھ مو ہی زمین تباہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۵۰ء و ۱۹۵۱ء میں تقریباً ۲۰۰۰ کیلو میٹر لمبے ڈام تعمیر کئے گئے۔ چین کے قونصل جنرل یاؤ چنگ کیانگ نے پچھلے سال کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہوائی اور جنگ کیانگ دریاؤں کے پروجیکٹس (PROJECTS) کی تکمیل نہایت شاندار کارنامہ ہے"۔ انھوں نے بتایا کہ اب تک کل ارضی کام ۱۷ لاکھ کیوبک میٹر ہوا ہے اور یہ کام دس نہر پناما اور ۲۰ نہر سوئیز بنانے کے سلسلے میں جس قدر ارضی کام کی ضرورت ہے اس کے برابر ہے۔ قابل غور ہے یہ رفتار جس سے پرانے غیر ترقی یافتہ چین میں تعمیری کام ہو سکتے ہیں اور غذا کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں پچھلے ۲۰ برس کے اندر غلہ کی پیداوار ۳۷ فی صدی فی ایکڑ بڑھ گئی ہے اور ایک فارم کا مزدور ۸۴ فی صدی زائد پیداوار کر سکتا ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۵۲ء میں غلہ کا ذخیرہ ۲۵۴۰ لاکھ بشلس (BUSHELS) تھا۔ ۱۹۵۳ء میں ۵۵۰۰ لاکھ تھا اور ۱۹۵۴ء میں ۶۴۰۰ لاکھ ہو جائے گا مگر ریاستہائے متحدہ کے محکمۂ زراعت نے اعلان کیا ہے کہ امریکہ میں گیہوں کی پیداوار "مانگ" سے زائد ہو گئی ہے (OVER PRODUCTION) لہذا کاشتکاروں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ ۱۹۵۳ء میں ۵۵ لاکھ ایکڑ گیہوں کی زمین کم کر دیں۔ ہمارے لئے ضرورت کے باوجود اس چیز میں (OVER PRODUCTION) ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ان حالات سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ میں بھی پیداوار بہت بڑھ گئی ہے۔ دراصل اس میں نئی نئی مشینوں اور ترقی یافتہ سائنس کی مدد شامل حال ہے۔ مثلاً نئے نئے آلاتِ زراعت کا استعمال، نئے نئے قسم کے پودوں کی کاشت (جیسے کہ مخلوط اناج) اچھے قسم کے کھاد کا استعمال وغیرہ وغیرہ۔ مخلوط اناج نے پیداوار بڑھانے میں کس طرح مدد کی اس کے بارے میں ٹی جنکنس (T. JENKINS) نے کہا ہے کہ "پہلی جنگِ عظیم کے تین سال کے اندر اندر بلین (BILLION) بشلس غلہ ۳۱۱۰ لاکھ ایکڑ زمین میں پیدا کیا تھا مگر دوسری جنگ عظیم میں تین سال کے اندر ہم نے ۹۱ بلین بشلس غلہ محض ۲۸۱۰ لاکھ ایکڑ زمین میں پیدا کیا"۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایٹمی قوت بھی زراعت میں استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ریاستہائے متحدہ اٹامک انرجی کمیشن کے صدر ڈیوڈ۔ ای لیلینتھل (DAVID. E. LILUNTHAL) نے ۱۹۴۹ء میں کہا تھا کہ "دو سال سے سائنسداں زراعت کیلئے بھی ایٹمی طاقت کے تحقیقاتی آلات استعمال کر رہے ہیں"۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ زراعت کے میدان میں ایٹمی قوت کا استعمال کس طرح کیا جا سکتا ہے مختلف تحقیقاتی کام جاری ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں سائنسدانوں کی ایک میٹنگ میں اس پر بحث کرتے ہوئے کہ ایٹمی قوت کا استعمال زرعی پیداوار کے لئے کس طرح کارآمد ہو سکتا ہے انھوں نے کہا

اب ہم اس قابل ہیں کہ دنیا کے سامنے مادہ نما اور امراض کی کنجی کھول کر رکھ دیں۔ ایٹمی سائنس کا ایک شاندار کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ نسلِ انسانی کے سامنے ایک نہایت مشکل مسئلہ کا حل پیش کرتی ہے اور وہ یہ کہ غذائی پیداوار کو کس طرح دنیا کی بڑھتی ہوئی

آبادی کے ساتھ چلایا جائے۔

انھوں نے یہ سب ٹھیک کیا مگر جب تک (OVER PRODUCTION) کا مسئلہ حل نہ ہوگا موجودہ سائنس سے صحیح اور پوری مدد نہ لی جاسکے گی۔

کہا جاتا ہے کہ برطانیہ نے بھی جنگ عظیم سے پہلے کی پیداوار کے مقابلہ میں ۴۰ فی صدی زائد پیداوار کر لی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ملک میں اپنی پوری آبادی کے پیٹ بھرنے کے لئے کافی غذا ہے۔ حال ہی میں اگریکلچرل ریسرچ کاؤنسل نے زراعت پر تحقیقات شروع کر دی ہیں۔ بیج کو نائٹرنٹ (NUTRIENT) کے حل میں بھگو کر بونے سے بہت اچھی پیداوار ہوتی ہے۔ OATS پر بھی POTASSIUM PHOSPHATES کے حل میں بھگو کر تجربہ کیا گیا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ سادے بیج بوئے گئے تو فی ایکڑ ۱۷ بشل۔ پانی میں جذب کئے ہوئے فی ایکڑ ۲۰ بشل اور PHOSPHATE میں جذب کئے ہوئے ۲۵ بشل پیدا ہوئے۔

ہیری فرگوسن کا خیال ہے کہ کھیتی کے جانوروں کی بجائے اگر مشین استعمال ہوں تو ۵۰ لاکھ ایکڑ زمین میں جو جانوروں کے لئے کاشت ہوتی ہے وہاں انسانوں کیلئے ہونے لگے اور ان کے خیال میں زراعت کو مشینی بنا دینے سے برطانیہ غذا کے سلسلہ میں درآمد سے آزاد ہو سکتا ہے۔

برطانیہ کے ایٹمی سائنسداں ڈاکٹر جان ایچ فرملین (DR. JOHN H. FRAMLIN) نے (ATOMIC SCIENTIST NEWS) میں لکھا ہے کہ مشرقی ممالک میں آبادی غذائی پیداوار سے زائد بڑھ رہی ہے لیکن روس اور مغربی ممالک میں غذائی پیداوار کی رفتار آبادی کی افزائش سے تیز ہے۔ انھوں نے اس پر زور دیا ہے کہ "غیر ترقی یافتہ ممالک مثلاً ہندوستان و پاکستان ایٹمی طاقت کا استعمال کریں"۔ انھوں نے کہا ہے کہ "برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک میں معلومات کا اسقدر ذخیرہ ہے کہ یہ مسئلہ بآسانی حل ہو سکتا ہے تعلیم یافتہ اور صنعتی ہندوستان کو موجودہ آبادی سے دگنی آبادی کو بھی غذا مہیا کرنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئے گی۔

البانیہ اگرچہ بہت چھوٹا ملک ہے مگر وہاں بھی ایک پنج سالہ پلان (۵۵-۱۹۵۱ء) بنایا ہے جس کے مطابق امید کی جاتی ہے کہ قومی دولت سو فیصدی بڑھ جائے گی۔ ۱۹۵۰ء میں آبپاشی کی جو زمین ۳۹۰۰۰ ہکٹیرس تھی پانچ سال کے اختتام پر ۸۳۰۰۰ ہکٹیرس ہو جائیگی۔ اناج کی پیداوار ۵۰ فی صدی بڑھ جائے گی اور گنے کی پیداوار ۱۶ گنا زائد ہو جائے گی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایک چھوٹا ملک بھی غذا کا مسئلہ حل کر سکتا ہے۔

ہندوستان میں غذا کی کمی چالیس یا پچاس لاکھ ٹن ہے اور خیال ہے کہ اگر غذائی پیداوار دس فی صدی تک بڑھ جائے تو ہندوستان اپنی کل آبادی کو غذا مہیا کر سکتا ہے۔ عام خیال ہے کہ یہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے اور اس کے حصول کی کوششیں جاری ہیں۔ حال ہی میں صوبے کی فصلوں کا ایک مقابلہ اتر پردیش میں ہوا تھا۔ اس میں گیہوں کی پیداوار ۵۴ من فی ایکڑ۔ چاول کی پیداوار ۸۳ من فی ایکڑ اور آلو کی پیداوار ۳۶۷ من فی ایکڑ ہوئی۔ حالانکہ گیہوں کی پیداوار یہاں اوسطاً آٹھ من فی ایکڑ ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ موجودہ حالت میں بھی سات گنا پیداوار زیادہ ہونی ممکن ہے۔ یو۔ پی میں آبپاشی کے ذرائع بڑھائے جا رہے ہیں اور زیادہ سے زیادہ زمین میں کاشت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یو۔ پی میں تو اس کی بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ چند ایف۔ اے۔ او (F.A.O) کے ماہرین کی

مدد سے اوسر زمین بھی زیر کاشت کر لی جائے۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ بہتر بیج استعمال کرنے سے پیداوار ۱۲ فی صدی بڑھ سکتی ہے اور اگر عمدہ کھاد بھی استعمال کی جائے تو ۲۵ فی صدی بڑھ سکتی ہے۔ زراعت کے ماہرین کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کے آدھے کھیتوں پر بھی نئے آلات کا استعمال کیا جائے تو دس فیصدی غذا کی جو کمی ہے وہ بآسانی پوری ہو جائے۔

غلہ کے علاوہ انسان نے غذا کے دوسرے ذریعوں میں بھی کافی ترقی کی ہے۔ سویڈن کی اطلاع ہے کہ وہاں دو سائنسداں عام خرگوشوں سے ڈھائی گنے بڑے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ عام طور سے خرگوش وہاں ۵½ پونڈ کے ہوتے ہیں مگر سائنس کی مدد سے پیدا کئے ہوئے یہ خرگوش ۱۲ پونڈ کے ہیں، اس تحقیق نے دیگر جانور مثلاً مچھلیاں، مرغیاں، بکریاں وغیرہ وغیرہ بھی عام سائز سے بڑے پیدا کرنے کے دروازے کھول دیئے ہیں۔

ان تمام حقیقتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کافی غذا نہ صرف اپنے لئے پیدا کرنے کے قابل ہے بلکہ وہ ضرورت سے کہیں زیادہ پیدا کر سکتا ہے۔ اگر کسی ملک میں غذا کی کمی ہے تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ وہاں کی پیداوار اپنی حد کو پہنچ چکی ہے اور آگے کوئی گنجائش نہیں رہی بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں موجودہ ترقی یافتہ سائنس سے کام نہیں لیا جا رہا ہے۔ قرنوں سے انسان نیچر پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور جتنا وقت گزرتا گیا وہ نیچر پر زیادہ سے زیادہ حاوی ہوتا گیا، انتہائی قنوطیت پسند لوگ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان میں نیچر پر مزید قابو پانے کی صلاحیت نہیں، انسان دوسرے جانوروں سے اس معنی میں مختلف ہے کہ وہ بجائے دنیا کے مطابق ڈھل جانے کے دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ انسان میں نیچر کو اپنے آگے جھکا لینے کی طاقت ہے جس کے لئے اس کے پاس سب سے بڑا حربہ علم سائنس ہے۔ لہٰذا جب تک ہم ان حقیقتوں سے انکار ہی نہ کریں اس وقت تک ہم مالتھوز کے پیروؤں سے متفق نہیں ہو سکتے

حقیقتاً اصل مسئلہ صحیح پیداوار کا نہیں ہے بلکہ (OVER PRODUCTION) کا ہے ہم روز سنتے ہیں کہ امریکہ میں، کیوبا میں شکر اور ہندوستان میں چائے مانگ سے زائد پیدا ہو گئی حالانکہ دوسری طرف دنیا انہی چیزوں کی بھوکی ہے۔ اگر "آزاد دنیا" اس مسئلہ کو حل کر لے تو پھر پیداوار بے حد و حساب ہو گی اور جب تک یہ لعنت دور نہ ہو گی موجودہ ترقی یافتہ سائنس کا پورا فائدہ زراعت کے میدان میں نہ اٹھایا جا سکے گا بلکہ اس کے استعمال میں ہمیشہ تکلف سے کام لیا جائے گا۔ (ترجمہ)

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

بڑا سائز چار سو صفحات قیمت چار روپے محصول ڈاک نو آنے

ادارۂ طلوع اسلام کراچی

نقد و نظر

۱۔ ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام

مذہب (خدا کی طرف سے عطا فرمودہ دین نہیں بلکہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب) کا آغاز ذہنِ انسانی کے عہد طفولیت کی تاریکیوں میں کچھ اس انداز سے ہوا کہ اس کے نام کے ساتھ ہی رموز و خفایا اور اسرار و باطنیت کی ایک پیچیدہ دنیا آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس نے ہولناک غاروں اور ظلمت انگیز خانقاہوں میں جنم لیا اور جنتر منتر، جادو، تعویذ، ورد و وظائف، کشف و کرامات، تاویلات و مرموزات کی بھول بھلیوں میں سے گذرتا، گرو سے چیلے، پیر سے مرید، معلم سے متعلم اور آمر سے مامور کے سینے میں "علم لدنی" بن کر آگے بڑھتا چلا آیا۔ (اور آجتک چلا آرہا ہے)۔ اس کے برعکس، خدا کا دین، درخشان آفتاب کی طرح دنیا میں آیا اور اس نے سارے عالم کو بقعۂ نور بنا دیا۔ نور کا خاصہ ہے کہ وہ خود بھی روشن ہوتا ہے اور ہر شے کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے۔ اسنے آکر اعلان کر دیا کہ دین میں کوئی راز نہیں۔ کوئی اسرار نہیں۔ کوئی پردہ نہیں، کوئی باطنیت نہیں۔ اس نے رسول کو حکم دیا کہ بلغ ما انزل الیک۔ جو کچھ تیری طرف نازل کیا جاتا ہے اسے تمام انسانوں تک پہنچا دے۔ چنانچہ دین کی خصوصیت ہی بلاغ للناس اور بیان للناس قرار دی گئی۔ اس قدر روشن، سادہ، کھلا اور نکھرا، واضح اور ابھرا ہوا دین جس میں نہ کوئی ابہام تھا نہ تاویل۔ نہ ریب تھا نہ تشکیک۔ یہ تھا وہ دین جسے قرآن نے پیش کیا اور جسے محمد رسول اللہ والذین معہ نے ایک جیتے جاگتے نظام کی شکل میں عملاً نافذ کر کے دکھا دیا۔ لیکن اس پر بہت تھوڑا عرصہ گذرنے پایا تھا کہ یہودیوں کے صومعوں، نصرانیوں کی خانقاہوں، اور مجوسیوں کے آتشکدوں سے فوج در فوج سازشی گروہ نکلے اور مسلمانوں کے نقاب میں، ان کے نظام کے اندر داخل ہو گئے اور ہنوز ان راہوں کی گرد بھی چھٹ کر بیٹھنے نہ پائی تھی کہ دنیا کی نگاہوں نے دیکھا کہ خدا کا وہی روشن اور تابناک دین، باطنیت کا طلسم ہوش ربا بن کر گیا۔ اس کی ابتدا شیعیت سے ہوئی جس کی ایک شاخ دنیا میں اسماعیلی مذہب کے نام سے متعارف ہے۔ اس مذہب کی ساری عمارت باطنیت کی بنیادوں پر استوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باہر کی دنیا ان کے اصلی معتقدات اور حقیقی تعلیم سے ناآشنا چلی آرہی ہے۔ باہر کی دنیا تو ایک طرف، خود ان کے اپنے اندر بھی ایک خاص حلقہ کے علاوہ، باقی لوگوں کی رسائی ان کی بنیادی کتابوں تک نہیں ہونے پاتی۔ مسلمانوں کو بالخصوص اور دنیائے علم و تحقیق کو بالعموم، ڈاکٹر زاہد علی صاحب سابق پروفیسر عربی اور وائس پرنسپل، نظام کالج، حیدرآباد (دکن) کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انھوں نے بڑی جرأت اور حوصلہ سے کام لیکر، ان رموز و اسرار سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ خود اسماعیلی ہیں اور ان کی عمر اپنے مذہب کی کتابوں کی جستجو اور مطالعہ میں گذری ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان کتابوں کے اصلی اقتباسات درج کر کے، اس مذہب کی تعلیم کو زیر نظر کتاب میں درج کر دیا ہے

اور ہر ایک شق کے بعد اپنے تبصرہ میں بتایا ہے کہ وہ تعلیم کس طرح اسلام کے صریحاً خلاف ہے۔ ہم نے اس سے پہلے ان باطنی مذاہب کے متعلق جو کچھ کہیں سے ملا اسے دیکھا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اس کتاب میں دکھائی دیا ہے، اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ کسی ایسے فرقہ کے معتقدات و تصورات ہو سکتے ہیں جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرتا ہے!! پہلے ہمارا خیال تھا کہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے وقت اس کے اقتباسات پیش کرتے جائیں گے تاکہ قارئین خود دیکھ لیں کہ اس مذہب کے پیروؤں کے معتقدات کیا ہیں۔ لیکن کتاب ختم کر لینے کے بعد محسوس ہوا کہ اگر ہم نے اقتباسات دینے شروع کر دیئے تو کم از کم آدھی کتاب نقل کرنی پڑے گی۔ مختصر الفاظ میں سن لیجئے کہ ان کے نزدیک (۱) لا الہ الا اللہ کے معنی ہیں لا امام الا امام الزماں۔ (۲) قرآن کی آیت لو کان فیہما الھۃ الا اللہ لفسدتا میں اللہ سے اشارہ امام کی طرف ہے (۳) ھو اللہ الخالق البارئ المصور سے مراد عقل اول یا امام الزماں ہیں۔ (۴) عالم الغیب والشہادت سے مقصود مولانا قائم ہیں جو قیامت کے دن ظاہر ہوں گے۔ (۵) سورۂ اخلاص میں آنحضرتؐ اور آپ کے اہل بیت کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ (۶) شرک کے معنی اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنا نہیں بلکہ ایک امام کی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے امام کی دعوت کو ملانا ہے۔ (۷) رسول اللہؐ کی حیثیت ایک مستودع کی ہے اور حضرت علیؓ مستقر۔ (۸) رسولؐ اللہ کے بعد ایک ساتواں رسول پیدا ہوا تھا جو اس مذہب کا بانی (محمد بن اسماعیل) ہے۔ (۹) انبیاء تمام (مع رسول اللہؐ کے) گنہگار ہیں اور صرف ان کے امام معصوم ہیں۔ (۱۰) حضرت علیؓ رسول اللہ کے ساتھ رسالت میں شریک تھے۔ (۱۱) حضرت علیؓ اور دیگر ائمہ کا رتبہ رسول اللہؐ سے چار درجے بڑا ہے۔ (۱۲) اذان میں اشھد ان محمد رسول اللہ سے ان کے مذہب کے اول امام محمد بن اسماعیل کی رسالت کی شہادت مراد ہے۔ (۱۳) قرآن کریم انجیل وغیرہ کی طرح محرف کتاب ہے (۱۴) شریعۃ، اسلام ۱۳۳۳ھ میں ان کے امام اول کے ہاتھوں معطل ہو چکی ہے اور اب معطل ہی رہے گی۔ (۱۵) اب مذہب کی بنیاد باطنی شریعت پر ہے جس کے رازدار ان کے ائمہ ہیں۔ (۱۶) قرآنی آیات کے معانی وہ نہیں جو ان کے الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو تاویل کی رو سے ان کے ائمہ نے کئے ہیں۔ ان تاویلات کی بڑی عجیب و غریب مثالیں کتاب میں درج کی گئی ہیں۔ (۱۷) امام سے اگر فواحش و منکرات کا بھی ارتکاب ہو جائے تو بھی اس کی امامت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ساری کتاب میں اسی قسم کے معتقدات کی تفاصیل اور ان کی مثالیں درج ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مذہب کا بانی کون ہے اور ان معتقدات کی سند کیا ہے؟ اس کا اصل بانی ہے، ایرانی نژاد، جون الغداح۔ اور اس کی سند، جیسا کہ ظاہر ہے، روایات ہیں۔ ان روایات کے متعلق، ڈاکٹر زاہد علی صاحب کا نظریہ وہی ہے جو طلوع اسلام کا ہے۔ یعنی وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ روایات لوگوں نے خود وضع کیں اور انھیں منسوب کر دیا ان کے ائمہ اور حضرت علیؓ اور رسولؐ اللہ کی طرف۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام کی طرح، ڈاکٹر صاحب نے بھی ان بزرگوں کی نسبت دامنِ ادب کو ہاتھ سے کہیں نہیں چھوڑا۔ اس کا علاج انھوں نے یہ بتایا ہے کہ ہمارے پاس قرآن کی کسوٹی موجود ہے۔ ہم سب کو اسی ایک مرکز پر جمع ہو جانا چاہئے۔

لہ ہم یہ کچھ دل پر جبر کر کے نقل کر رہے ہیں اور فقرے فقرے پر معاذ اللہ کہتے ہوئے اس کا اعلان کرتے ہیں کہ نقلِ کفر کفر نباشد۔

ہم محترم ڈاکٹر زاہد علی صاحب کو اس قابلِ فخر کتاب کی تصنیف اور اکادمی آف اسلامک اسٹڈیز حیدرآباد (دکن) کو اس کی اشاعت پر درخورِ صد مبارکباد سمجھتے ہیں۔ کتاب کی ضخامت ۶۶۴ صفحات ہے اور ملنے کا پتہ ہے الہدیٰ بک ایجنسی معظم بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد (دکن) قیمت کتاب پر درج نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس قسم کی کتابیں جس قیمت پر بھی مل جائیں سستی ہوتی ہیں۔ (مصنف کی دوسری کتاب "تاریخ فاطمیین مصر" ہے جس پر کسی آئندہ اشاعت میں تبصرہ کیا جائے گا۔)

حدیثِ دفاع

نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ ایک ایسے جگمگاتے ہیرے کی طرح ہے جس کے مختلف گوشے ہیں۔ لیکن ہیرے کو جس گوشے سے دیکھئے وہ ہیرا ہوتا ہے۔ میجر جنرل محمد اکبر خاں، ایک سپاہی ہیں جن کی ساری عمر عسکری مہمات میں گذری ہے۔ انھوں نے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ ایک سپاہی کی نگاہ سے کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ وہ ذاتِ اقدس جس نے انسانی زندگی کے تمدنی اور معاشرتی دوائر میں اس قسم کا عدیم النظیر انقلاب برپا کر دیا تھا، اس نے جنگ کے میدان میں ایک بالغ نظر اور کشادہ ظرف سپہ سالار کی حیثیت سے کیا کچھ کر دکھایا تھا۔ انھوں نے سیرتِ طیبہ کے اس گوشے کا نام "حدیثِ دفاع" رکھا ہے جو ۳۳۶ صفحات پر پھیلی ہوئی تصنیف ہے جسے میسرز فیروز سنز (لاہور) نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ کتاب کی قیمت (مجلد) پانچ روپے ہے۔ کتاب بہیئت مجموعی اچھی ہے لیکن اس میں بعض باتیں ایسی ہیں جو نگہ بصیرت میں کھٹکتی ہیں۔ مثلاً اصحاب فیل کا مشہور واقعہ بیان کرتے ہوئے جنرل صاحب فرماتے ہیں کہ "آسمان پر ابابیلوں کی فوج نمودار ہوئی جنھوں نے اپنی چونچوں سے اسقدر سنگریزے گرائے کہ ابرہہ کے ہاتھیوں کا لشکر بدحواس ہو کر بھاگ گیا"۔ حیرت ہے کہ فوج کا ایک جرنیل بھی قصہ گو واعظوں کی اس داستان کو باور کر لیتا ہے کہ ابابیلوں کی کنکریوں سے ہاتھیوں کا لشکر بدحواس ہو کر بھاگ نکلا تھا؟ ایک مقام پر لکھا ہے کہ "ہمیں اس کا پورا احترام ہے کہ حضرتؐ کی فطری صلاحیتیں اور وہبی طاقتیں غیر معمولی تھیں۔ کسی معمولی انسان سے آپ کا مقابلہ کرنے کی جسارت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن میدانِ عمل میں آپ نے جو کچھ کیا وہ بحیثیت اس انسان ہی کے کیا جو عالمِ اسباب کے قانونِ علت و معلول کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا"۔ یہ بالکل بجا اور درست ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرے مقام پر یہ عبارت بھی ہماری نظر پڑتی ہے کہ "دشمن کے حملہ کو دیکھکر آپ نے آسمان کی طرف نظر کی اور مٹھی بھر خاک اٹھا کر دشمن کی طرف اڑائی اس کا اثر دیکھکر آپ نے خدا کا شکر ادا کیا"۔ جنرل صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اس مٹھی بھر خاک کا کیا اثر ہوا تھا۔ نہ ہی یہ کہ یہ چیز سلسلۂ علت و معلول کی کونسی کڑی سے متعلق تھی؟ علاوہ بریں کتاب میں سیرتِ نبی اکرمؐ کے متعلق اس قسم کی روایات بھی درج کر دی گئی ہیں جو عام طور پر ہمارے ہاں مروج ہیں لیکن جو ایک رسول کے قطعاً شایانِ شان نہیں۔ فلہٰذا وضعی اور جھوٹی ہیں۔ مثلاً کعب بن اشرف کے قتل کا واقعہ۔ لیکن اس باب میں ہم مصنف کو معذور سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ فوج کے جرنیل ہیں۔ آثار و سیرت کے محقق نہیں۔

کتاب کے نام (حدیثِ دفاع) اور ڈسٹ کور سے قطعاً معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس کا موضوع کیا ہے۔ اگرچہ کتاب کے اندر مختلف نقشے بھی دیئے گئے ہیں جن سے غزواتِ نبویؐ کے مقامات کا تعین ہو جاتا ہے۔

ISLAMIC SOCIAL FRAMEWORK | مصنف۔ پروفیسر ریحان شریف صاحب۔ ناشر : ORIENTALIA میکلوڈ روڈ۔ لاہور۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ قیمت (مجلد) چھ روپے۔

اس تمدنی چوکھٹے میں ان خطوط کو مختصر طور پر نمایاں کیا گیا ہے جن سے (مصنف کے نزدیک) اسلامی معاشرہ کی تصویر ترتیب پائی ہے۔ ان میں سب سے اہم "اسلامک سوشلزم" کا باب ہے۔ ہم نے اس باب کو سب سے اہم اس لئے قرار دیا ہے کہ کچھ عرصہ سے یہ اصطلاح (اسلامک سوشلزم) بہت عام ہو رہی ہے۔ لیکن ہم باوجود تجسس بسیار آخر تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ اس سے بالآخر مفہوم کیا ہے۔ آپ کسی سوشلسٹ سے پوچھئے کہ سوشلزم کیا ہے تو وہ اس کے متعلق واضح اور متعین انداز سے بتا دیگا کہ اس سے مفہوم کیا ہے۔ نیز وہ اس کے متعلق اس لٹریچر کی بھی نشان دہی کر دیگا جس سے اس اجمال کی تفصیل سمجھ میں آجائے۔ لیکن "اسلامک سوشلزم" کہنے والوں میں سے آپ جس سے بات کیجئے اول تو اس کے ذہن میں اس کے متعلق کوئی واضح مفہوم نہیں ہوگا اور پھر جو مفہوم کسی ایک کے ذہن میں ہوگا وہ دوسروں کے مفہوم سے مختلف ہوگا۔ زیر نظر کتاب میں بھی (اس موضوع پر دوسری کتابوں کی طرح) زکوٰۃ کو اسلامک سوشلزم کی اصل و بنیاد بتایا گیا ہے اور اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے مراد اڑھائی فیصدی انکم ٹیکس ہے۔ اس کے بعد زکوٰۃ کے مصارف کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "کیا معاشرتی تحفظ کی کوئی اور اسکیم اس سے زیادہ جامع ہو سکتی ہے؟ پروفیسر صاحب کو چاہئے تھا کہ وہ ذرا تفصیل سے بتاتے کہ ۲½ فیصدی انکم ٹیکس کس طرح معاشرتی تحفظ کی سب سے زیادہ جامع اسکیم ہے؟ انھوں نے لکھا ہے کہ اسلام میں دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں۔ لیکن انھوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا کہ جب اسلام میں دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں تو پھر زکوٰۃ کس روپے پر دی جائیگی۔ اسی طرح انھوں نے لکھا ہے کہ اسلام میں زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی تحریر ہے کہ عرب میں اسلامی اصولوں کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت ناجائز نہیں تھی! اسلام میں اصولِ تقنین کے ضمن میں اسی مروجہ خیال کو پیش کر دیا گیا ہے کہ قانون کے ماخذ چار ہیں۔ قرآن، سنت، اجماع، قیاس۔ لیکن اس مسئلہ کے لئے سند کوئی نہیں دی گئی۔ کتاب کی زبان صاف ہے اور لکھائی چھپائی اچھی۔

خضرِ راہ | علامہ اقبالؒ کی مشہور اردو نظم "خضرِ راہ" کا انگریزی ترجمہ از A.Q. NIAZ ناشرین FRIENDS COUNSEL میکلوڈ روڈ لاہور۔ چالیس صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

علامہ اقبال کے کلام کا ترجمہ آسان نہیں۔ لیکن نیاز صاحب کا یہ ترجمہ بڑا کامیاب ہے۔ انگریزی نظم میں وہی روانی اور وہی جوش چھلکتا نظر آتا ہے جو اقبال کے پیغام کی خصوصیت ہے۔ شروع میں مہر صاحب کا مختصر سا مقدمہ ہے۔

اندلسی حکومت

۱۵ اگست ۷۵۰ء کو بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان ثانی کو عباسیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تو بنو عباس نے خاندانِ امیہ کے افراد کو چن چن کر ختم کرنا شروع کر دیا۔ پھر بھی ایک نوجوان لڑکا بچ نکلا۔ یہ تھا عبدالرحمٰن خلیفہ مروان کا بھتیجا اور خلیفہ ہشام کا پوتا جس نے پانچ سال کی تگ و دو کے بعد اکیس سال کی عمر میں ایک نشین کے لٹ جانے پر دوسرے نشیمن کی بِنا ہسپانیہ میں جا ڈالی اور وہاں اس دور کا آغاز کیا جس پر آج کے اہلِ ہسپانیہ کو بھی فخر و ناز ہے۔

حال ہی میں لاہور سے ایک کتاب (بزبان انگریزی) چھپی ہے

FALCON OF SPAIN BY Dr. IRVING. PUBLISHERS. ORIENTALIA, LAHORE.

PAGES 158, PRICE Rs 6/-

مصنف کو اپنے تدریس و تحقیق کے دوران میں عربی اور ہسپانوی دونوں زبانوں سے شغف رہا ہے۔ بقول ان کے انھوں نے اس کتاب میں زیادہ تر عربی نکتہ نظر کو پیش کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کتاب کے بعض حصوں یا مصنف کی آراء سے آپ اختلاف کریں لیکن کتاب ہمارے اندلسی دور کے ابتدائی ایام کا ایک اچھا خاصہ نقشہ پیش کرتی ہے۔ زمانہ دوسری صدی ہجری یا آٹھویں صدی عیسوی کا ہے۔ ہر باب کے آخر میں مفید نوٹ ہیں۔ خالص وقائع نگاری کے علاوہ طرزِ حکومت، تجارت، تہذیب و تمدن پر بھی مختصر باب ہیں۔

عام طور پر ہمارے ہاں ہسپانیہ کے متعلق قصے کہانیوں کی کتابیں ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر اس دور کی باتیں ہیں جب وہاں مسلمانوں کی سلطنت دم توڑ رہی تھی۔ اس لحاظ سے اس قسم کی کتابیں زیادہ مفید ہو سکتی ہیں جو اس دور کا ذکر کریں جب مسلمان کچھ بنایا کرتے تھے۔ اور باوجود ان نقائص کے جو ان کے معاشرہ میں آ گئے تھے ان کے اندر اتنے جوہر باقی تھے کہ میزانِ عمل میں ابھی ان کے تعمیری کاموں کا پلڑا بھاری تھا۔

دیکھئے۔ اپنا خریداری نمبر تلاش کیجیے!

اگست ۱۹۵۴ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا آئندہ ماہ ستمبر ۱۹۵۴ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ اگست ۱۹۵۴ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ اگست سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرما دیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔ فہرست خریداران جن کا چندہ ماہ اگست میں ختم ہوگا۔

۳۴ — ۷۵ — ۱۲۱ — ۲۵۸ — ۹۹۹ — ۱۰۱۰ — ۱۰۷۳ — ۱۲۱۳ — ۱۲۱۷ — ۱۴۴۴ — ۱۵۲۷ — ۱۵۴۴ — ۱۵۵۲ — ۱۵۶۵ — ۱۵۷۱ — ۱۵۷۶ —
۱۵۷۷ — ۱۵۸۲ — ۱۵۸۳ — ۱۵۸۴ — ۱۵۸۵ — ۱۵۸۷ — ۱۵۸۹ — ۱۵۹۰ — ۱۵۹۱ — ۱۵۹۳ — ۱۵۹۴ — ۱۵۹۵ — ۱۵۹۶ —
۱۵۹۷ — ۱۵۹۸ — ۱۵۹۹ — ۱۶۰۰ — ۱۶۰۲ — ۱۶۰۷ — ۱۶۰۸ — ۱۶۰۹ — ۱۶۱۰ — ۱۶۲۶ — ۱۶۲۷ — ۱۶۴۲ — ۱۶۴۳ —

باب المراسلات

ذوالقرنین

لائل پور سے ایک صاحب کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ذوالقرنین کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جو میرے لئے ایک عرصے سے الجھن کا باعث بنا ہوا ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں معارف القرآن جلد سوم بھی دیکھی ہے اور بعض مفسرین کے حواشی بھی دیکھے ہیں لیکن میری تشفی نہیں ہو سکی۔ اور بار بار میرے لئے یہ بات کھٹک بن جاتی رہی ہے کہ خداوند پاک نے سورۂ کہف میں اس کا تذکرہ کیوں کیا اور پھر پورے قرآن پاک میں جس مقام پر یہ تذکرہ موجود ہے اس کا ربط مجھے سیاق و سباق سے سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے امید ہے آپ میرے بعض اشکالات جو اس ضمن میں پیدا ہوئے ہیں اولیں فرصت میں دور فرما کر مجھے شکر گذار فرماویں گے۔ میرے لئے سب سے پہلے اس شخص کا عدم تعین وجہ الجھن ہے، کیونکہ سوال کرنے والوں کو کوئی واضح جواب نہیں دیا گیا کہ ذوالقرنین کون ہے؟ آیا ذوالقرنین ذاتی نام ہے یا صفاتی۔ اگر یہ ذاتی نام ہے تو تاریخ میں اس نام کا کوئی فرد نہیں ہوا۔ اور اکثر مفسرین نے اسے ذاتی نام نہیں سمجھا اور آپ نے بھی اسے کیخسرو پر چپاں کیا ہے۔ اس لئے اگر یہ صفاتی نام ہے تو صفاتی نام کیوں اختیار کیا گیا۔ اس سے تو سائلوں کے سوال کا جواب بے حد مبہم رہ گیا ہے۔ وہ ابہام میں تو پہلے سے ہی تھے اور اسی بارے میں وہ ایک یقین تک پہنچنا چاہتے تھے۔ انھیں پھر سے ابہام میں ڈالنا تو جواب نہیں کہلا سکتا۔

اب اگر صفاتی نام ہی اختیار کیا گیا تھا تو پھر اس کی سلطنت کی حدیں مبہم بیان کر دی گئیں۔ مطلع الشمس اور مغرب الشمس تو کرۂ ارض پر کسی جگہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے بھی اس فرد کا کچھ علم نہیں ہو سکتا کہ وہ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ پھر ایک اور مبہم کردار اس کہانی میں INTRODUCE کرا دیا گیا ہے جسے یاجوج ماجوج کے نام سے پکارا گیا ہے۔ یہ کردار بھی آخر تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ اگر یہ تمام کوئی تمثیل ہے تو یسئلونك عن ذی القرنین کے کیا معنی ہوئے؟ اور اگر یہ کوئی واقعہ ہے تو تاریخ میں یہ واقعہ صفاتی ناموں کی آڑ میں ڈھونڈھنے کی کوشش بھی کی جائے تو صفاتی ناموں کے استعمال کی آخر کیا مصلحت تھی؟ اگر یہ کہا جائے کہ ابھی آثار قدیمہ پر سے مزید پردے نہیں اٹھے ہو قرآن پاک کے اس واقعہ کو کمال صفائی سے من وعن بیان کر دیں تو سوال مستقبل میں نہیں ہوگا بلکہ قرآن جب نازل ہو رہا تھا سوال اس دور میں ہو چکا ہے۔ اس لئے جب سائلوں کو اس کا جواب نہ ملا تو جواب دینے سے کیا حاصل۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس واقعہ میں رموزِ مملکت اور آئینِ جہانبانی بیان کئے گئے ہیں تو ابہام کا اشکال تو اپنی جگہ ہی قائم رہا۔ ایک غیر معروف و مجہول واقعہ سے جہانبانی کے رموز بیان کرنے کا کیا مطلب؟ سلیمان بھی بادشاہ تھے، داؤد بھی بادشاہ تھے۔ ان دونوں اسرائیلی بادشاہوں کا سابقہ بھی دشمنوں سے پڑا تھا۔ دونوں نبی بھی تھے

اور بے حد معروف و مشہور شخصیتیں تھیں۔ ان کا انتخاب خداوند نے کیوں نہ کیا؟ ان کا تذکرہ بھی کئی ایک مقامات پر قرآن پاک میں موجود ہے۔ یہ کام تو ان کے تذکروں سے بھی لیا جا سکتا تھا۔

طلوع اسلام

قبل اس کے کہ ذوالقرنین کے متعلق کچھ لکھا جائے ان اعتراضات کا دیکھنا ضروری ہے جنھیں محترم مفسر نے اپنے خط میں بطور خدشات کے بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

(۱) سوال کرنے والوں کو کوئی واضح جواب نہیں دیا گیا کہ ذوالقرنین کون ہے؟ اور آیا اس کا یہ نام ذاتی ہے یا صفاتی ہے؟

(۲) اگر یہ صفاتی نام ہے تو اسے کیوں اختیار کیا گیا؟ اس سے تو سائلوں کے سوال کا جواب بجائے مبہم رہ گیا۔

(۳) جب سائلوں کو اس کا جواب نہ ملا تو جواب دینے سے کیا حاصل؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ سائلین کو ان کے سوال کا واضح اور تشفی بخش جواب نہیں ملا۔ قرآن میں ایک گروہ کی طرف سے ایک سوال کا ذکر ہے اور اس کے بعد اس کا جواب دیا گیا ہے۔ نہ تو قرآن میں یہ لکھا ہے کہ اس جواب سے سائلین کی تسلی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی تاریخ میں سائلین کی طرف سے کہیں کہا گیا ہے کہ ہمارے نزدیک یہ جواب بالکل مبہم تھا۔ اس سے ہماری تشفی نہیں ہوئی۔ جب صورت حال یہ ہے تو ہمارے پاس کیا دلیل ہے جس کی بنا پر ہم یہ کہیں کہ اس جواب سے سائلین کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اور بات مبہم سے مبہم تر ہو گئی۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس جواب سے آپ پر بات واضح نہیں ہوئی۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے نبی اکرم صلعم کے مخاطبین پر بھی بات واضح نہیں ہوئی۔

اسی سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن نے یہ صفاتی نام کیوں استعمال کیا ہے، قرآن نے کہا ہے ویسئلونك عن ذی القرنین (تجھ سے ذوالقرنین کے متعلق دریافت کرتے ہیں) اس سے ظاہر ہے کہ یہ نام خود سائلین نے استعمال کیا تھا اور جس کے متعلق انھوں نے پوچھا تھا وہ اس صفاتی نام سے معروف تھا۔ قرآن نے اسی معروف شخصیت کے متعلق جواب دیدیا۔ اگر آج (کسی وجہ سے) یہ صفاتی نام ہمارے لئے غیر معروف ہو گیا ہو تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ نام سائلین کے نزدیک (یا اس دور میں بھی) غیر معروف تھا۔ بعض اوقات (بلکہ بڑی بڑی شخصیتوں بالخصوص بادشاہوں کے سلسلہ میں تو اکثر اوقات) صفاتی نام ایسے معروف ہوتے ہیں کہ اگر ان کی جگہ ذاتی نام لیا جائے تو لوگوں کو پوچھنا پڑتا ہے کہ اس سے کون مراد ہے۔ مثلاً اگر آپ کسی سے کہیں کہ ظہیر الدین بادشاہ نے یہ کہا ہے تو آپ سے ہر ایک پوچھے گا کہ کون ظہیر الدین؟ لیکن جب آپ کہیں گے کہ بابر!! تو ہر ایک سمجھ جائے گا کہ اس سے کون مراد ہے۔ یا مثلاً آپ پنجاب میں اگر کسی سے کہیں کہ میں سید علی ہجویری کے مزار پر گیا تھا (تو چند پڑھے لکھے لوگوں کے سوا) کوئی نہیں سمجھے گا کہ اس سے کون مراد ہیں۔ لیکن اگر آپ کہیں کہ میں داتا صاحب کے دربار گیا تھا تو لکھے پڑھے اور ان پڑھ دونوں سمجھ جائیں گے کہ آپ کہاں گئے تھے۔ بہر حال مطلب یہ تھا کہ سائلین نے خود بھی صفاتی نام کے ساتھ سوال کیا اور اسی سوال سے یہ مترشح ہوتا ہے

کہ جس کی بابت سوال کیا گیا تھا وہ اپنے اس صفاتی نام سے عام طور پر مشہور تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ قرآن نے اس کا ذاتی نام، مقام اور تاریخ پیدائش اور دیگر اسی قسم کی تفصیلات کیوں بیان نہیں کیں۔ تو اس کا جواب تو ظاہر ہے کہ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ وہ اس سوال کے جواب میں تاریخی تفصیلات بیان کرتا۔ سائلین نے جو کچھ معلوم کرنے کیلئے سوال کیا تھا، قرآن نے اپنے آپ کو انہی تفاصیل تک محدود رکھا ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ ذوالقرنین کون تھا؟ یہودی نسل پرست قوم تھی جن کے نزدیک قابل فخر و ستائش شخصیت صرف یہودیوں کے اندر پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن ذوالقرنین ایک ایسا شہنشاہ ہے جو غیر یہودی ہونے کے باوجود یہودیوں کے ہاں بڑا واجب الاحترام ہے اس لئے کہ یہی وہ شہنشاہ تھا جس نے انھیں بابل کی المناک اسیری کے عذاب سے نجات دلائی تھی اور جس کے ہاتھوں دانیال، یسعیاہ اور یرمیاہ نبی کی پیشین گوئیاں پوری ہوئیں۔ یہ پیشین گوئیاں تورات میں آج بھی موجود ہیں۔ دانیال نبی نے اپنے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک مینڈھا ہے جس کے دو بڑے بڑے سینگ ہیں۔ جبریل نے انھیں اس خواب کی تعبیر بتائی کہ یہ میڈیا اور فارس کی دونوں سلطنتوں کا شہنشاہ ہے جس کے ہاتھوں یہودیوں کو اہل بابل کی غلامی سے نجات ملے گی۔ یہ تھے وہ دو سینگ جس سے یہ نجات دہندہ یہودیوں کے ہاں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا۔ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں اس دو سینگوں والے کا نام خُرس لکھا ہے جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ "وہ میرا چرواہا ہے وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا" چنانچہ جب میڈیا اور فارس کے شہنشاہ کیخسرو (خرس) نے بابل فتح کر کے یہودیوں کو نجات دلائی ہے تو دانیال نبی نے اسے یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی دکھائی جو اس واقعہ سے قریب ڈیڑھ سو سال پہلے کی گئی تھی۔ کوئی سو برس کا عرصہ ہوا اصطخر کے کھنڈرات سے اسی خرس کا ایک مجسمہ برآمد ہوا ہے جس کے سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہنشاہ خود اہل فارس کے ہاں بھی دو سینگوں والا ہی مشہور تھا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ قرآن میں مطلع الشمس اور مغرب الشمس کے جو الفاظ آئے ہیں وہ کرۂ ارض پر ہر جگہ ہو سکتے ہیں اس لئے یہ جواب بھی متعین نہیں۔ اسے پھر دہرا لیجئے کہ سوال یہودیوں کی طرف سے تھا اور تورات میں پورب اور پچھم کے ممالک کے لئے "سورج نکلنے کے ممالک" اور "سورج ڈوبنے کے ممالک" کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ لہٰذا قرآن نے یہ بتانے کے لئے کہ وہ پہلے ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کا تمام سفر طے کرتے ہوئے لیڈیا کے دارالحکومت سارڈس کو فتح کر کے سمندر کے کنارہ تک جا پہنچا جہاں شام کے وقت سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد اس نے مشرق کی طرف لشکر کشائی کی جسے باختر کا علاقہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کی تیسری لشکر کشائی سلسلۂ کوہ کاکیشا کی طرف تھی جہاں اس نے درۂ کوہ میں دیوار بنائی تھی تاکہ شمالی علاقہ کے وحشی قبائل یاجوج و ماجوج وہاں سے حملہ آور ہو کر اس علاقہ کے باشندوں پر مزید ظلم نہ کر سکیں۔ واضح رہے کہ جس طرح اس زمانہ کے مخاطبین کیلئے ذوالقرنین کوئی غیر مانوس لفظ نہ تھا۔ اسی طرح وہ یاجوج اور ماجوج کے ناموں سے بھی ناآشنا نہیں تھے (اسوقت یاجوج و ماجوج کی تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ آپ کا بنیادی سوال ذوالقرنین ہی کے متعلق ہے)۔

ہمارا خیال ہے کہ ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ نہ تو قرآن کا جواب اپنے مخاطبین کیلئے مبہم تھا اور نہ ہی ایسا جس سے ان کا اطمینان نہ ہوا ہو۔ قرآن میں بیان کردہ تاریخی احوال وکوائف کے متعلق ہمارے دلوں میں اعتراضات اس لئے اٹھتے ہیں کہ قرآن نے ان باتوں کو اس طرح بیان نہیں کیا جس طرح ہم چاہتے ہیں کہ وہ ایک تاریخی کتاب کیطرح بیان کرتا۔ اور ان کے سمجھنے میں جو دشواری ہمیں پیش آتی ہے وہ اس لئے کہ ہمارے ہاں ابھی ایسا لٹریچر موجود نہیں جس میں دورِ حاضرہ تک کی تاریخی تحقیقات اور عصری انکشافات کی روشنی میں متعین طور پر بتایا جائے کہ ان واقعات کے تاریخی تعینات کیا ہیں۔

اب، رہا یہ سوال کہ قرآن نے ذوالقرنین کے متعلق اپنے ہاں یہ کچھ درج ہی کیوں کیا ہے اور اس میں ہمارے لئے کونسی حکمت اور مصلحت ہے۔ سو پہلی چیز تو یہی کہ رسول اللہ صلعم کو جو کچھ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی علم دیا جاتا تھا وہ سب قرآن کے اندر درج ہوتا تھا۔ ذوالقرنین کے متعلق سوال کا جواب چونکہ رسول اللہ صلعم نے اپنی طرف سے نہیں دیا بلکہ وحی کی بنا پر دیا تھا اس لئے وہ قرآن میں درج ہوا۔ اور اس میں حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ قرآن نسلی، جغرافیائی اور مذہبی گروہ بندیوں میں گھرا ہوا نہیں۔ اسے جہاں کہیں انسانی سیرت وکردار کے بلند نمونے ملتے ہیں وہ ان کی بلندی کا اعتراف کرتا ہے۔ سائرس، جناب زرتشت کا پیرو تھا اور اگرچہ قرآن نے زرتشت کو تصریحی طور پر زمرۂ انبیاء میں ذکر نہیں کیا لیکن ان کے پیرو کے عدل وانصاف اور انسان دوستی کی بلند صفات کا نہایت کشادہ ظرفی سے اعتراف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جواب تو صرف یہودیوں کے سوال کا دیا جا رہا ہے لیکن ذوالقرنین کی اس بلندیٔ سیرت کو ہر مقام پر اجاگر کر کے دکھایا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ صفات بنی اسرائیل کے ان انبیاء میں بھی موجود تھیں جن کی حکمرانی کے تذکرے قرآن میں آئے ہیں لیکن جب کسی سلسلہ میں ایک دوسری قوم اور دوسری سرزمین کے حکمران کا تذکرہ آگیا تو قرآن نے اسی کشادہ نگہی سے اس کی محمودہ صفات کا بھی ذکر کر دیا۔

امید ہے کہ ان اشارات سے آپ کا اطمینان ہو جائے گا۔

اسبابِ زوالِ امت

محترم پرویز صاحب کا وہ معرکۃ الآراء مقالہ جس نے قوم میں سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب ونگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا اور جس کے لئے کئی بار چھپنے کے باوجود پیہم تقاضے موصول ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا فرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا۔ اس کتاب کا نسخہ ہر نوجوان کے سرہانے رہنا چاہیئے کیونکہ اس سے ہم دوبارہ زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔

ضخامت ۵۰ صفحات۔ کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ۔ قیمت مجلد مع گردپوش ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

باسمہ سبحانہ

اختلافُ اُمّتی رحمۃ

(میری امت کا آپس میں اختلاف رکھنا ایک رحمت ہے)

(علامہ تمنا عمادی۔ ڈھاکہ)

کہا جاتا ہے کہ یہ خلافِ عقل اور خلافِ قرآن مجید بات (نعوذ باللہ من ذلک) حدیث رسول ہے۔ باوجود اس کے کہ حدیث کی جو معتبر چھ کتابیں ہیں بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ جن کو صحاح ستہ کہتے ہیں، اور حدیث کی سب سے پہلی کتاب امام مالکؒ کی موطا۔ ان میں سے کسی کتاب میں بھی یہ حدیث نہیں ملتی۔ اسی قدر نہیں بلکہ جن کتابوں کا درجہ ان سات کتابوں کے بعد ہے، جیسے امام شافعیؒ کی کتاب الام[1]، مسند امام احمد[2]، مسند امام شافعی[3]، مسند امام ابوحنیفہ[4]، موطائے امام محمد[5]، سنن دارمی[6]، سنن دارقطنی[7]، مسند ابوداؤد الطیالسی[8]، مستدرک حاکم[9]، سنن ابن جریج[10]، سنن ابن اسحٰق[11]، سنن ابن قرہ موسیٰ بن طارق[12]، سنن عبدالرزاق بن ہمام[13]، جامع المسانید ابن جوزی[14]، جامع المسانید ابن کثیر[15]، مسند ابویعلی[16]، مسند بزار[17]، معجم کبیر طبرانی[18]، مجمع الزوائد[19]، سنن کبریٰ نسائی[20]، سنن کبریٰ بیہقی[21]، کنز العمال[22]، جمع الجوامع للسیوطی[23]، اتحاف الخیرہ بزوائد المسانید العشرہ لاحمد بن ابی بکر البوصیری[24]، مسند حمیدی[25]، مسند مسدد[26]، مسند ابن ابی عمر[27]، مسند اسحٰق بن راہویہ[28]، مصنف ابن ابی شیبہ[29]، مصنف احمد بن منیع[30]، مصنف عبد بن حمید[31]، مسند حارث بن محمد بن ابی اسامہ[32]، المختارہ لمحمد بن عبدالواحد المقدسی[33]، اور بحر الاسانید حافظ احمد بن حسن السمرقندی وغیرہ احادیث کی مشہور کتابوں میں کہیں اس حدیث کا نام و نشان نہیں۔ مگر پھر بھی مخالف قرآن مجید و مخالف عقل سلیم ہونے کے باوجود یہ گمراہ کن قول ہمارے علماء کے نزدیک حدیث رسول ہے۔ اور اس کو اس طرح فرقہ پرستی کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے جیسے یہ قرآن مجید کی کوئی آیت ہی ہو، یا کم سے کم سلف سے خلف تک سارے علمائے دین کی ایک متفق علیہ کوئی حدیث متواتر ہے۔ جس کے سننے کے بعد ہر مسلمان کا فرض ہے کہ سر تسلیم خم کر دے۔

حافظ سیوطی کے ہاں

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ کی ایک کتاب "جامع صغیر" ہے جس میں یہ حدیث ملتی ہے مگر مجھے اس کا یقین ہے کہ یہ حدیث جامع صغیر میں داخل کر دی گئی ہے۔ جلال الدین سیوطی نے خود اس کو اپنی کتاب میں درج نہیں کیا ہے۔ اگر یہ سیوطی اس کو اس مختصر سی کتاب میں درج کرتے تو اپنی ضخیم کتاب "جمع الجوامع" میں بھی ضرور درج کرتے کیونکہ اس طویل و عریض کتاب کا نام ہی بتا رہا ہے کہ اس میں حافظ سیوطی نے حتی الوسع ساری حدیثوں کو جمع کر دیا ہے۔ پھر یہ حدیث اگر واقعی ان کے نزدیک حدیث رسول تھی تو اس ضخیم کتاب میں اس کو جگہ کیوں نہ دی؟

بہرحال اختلاف پسند و فرقہ پرست علماء چونکہ جامع صغیر ہی کے حوالے سے اس گمراہ کن قول کو حدیث رسول کہہ کر پیش کرتے ہیں اسلئے جامع صغیر کے حوالے کو تسلیم کرتے ہوئے ہی مجھ کو اس وقت بحث کرنا ہے، کیونکہ جامع صغیر میں اس کے وجود سے تو انکار

کیا نہیں جاسکتا۔ وضاعین وکذابین نے ایک حدیث بنا کر جامع صغیر میں داخل کردی ہے، صرف اتنا کہدینے سے روایت پرستوں کو خاموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ سہی، جامع صغیر کی تو ضرور ہے۔ میں اسی حیثیت سے اس پر بحث کرتا ہوں۔

جلال سیوطی تو دسویں صدی کے آدمی ہیں، اس لئے یہ دیکھنا واجب ہے کہ اس حدیث کو یہ لائے ہیں کہاں سے؟ تو جامع صغیر میں خود حوالہ موجود ہے کہ اس کو نصر المقدسی نے اپنی کتاب الحجۃ میں، اور بیہقی نے رسالہ الاشعریہ میں اس کو معلق بغیر سند کے لکھا ہے۔ پھر شارح جامع صغیر خود لکھتے ہیں لکنہ لم یجزم بہ بل قال روی یعنی بیہقی نے اس کو یقینی طور سے نہیں لکھا ہے بلکہ لکھا ہے کہ "روایت کی گئی ہے" یعنی اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے اور مشکوک طریقے سے بیان کیا ہے جس کو آخر میں خود ہی صاف طور سے لکھدیا کہ قال الشیخ حدیث ضعیف یعنی شیخ نے کہا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ یہ تو خود اس کے روایت کرنے والوں کا اعتراف ہے مگر تحقیق کی نظر ڈالنے کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے کہ فقط ضعیف ہی نہیں یہ بالکل موضوع حدیث ہے، ایک من گھڑت قول ہے ایک گمراہ کن مقولہ ہے جس کی نسبت کسی مفسد نے پہلے پہل رسول اللہ صلعم کی طرف کردی۔ اس کے بعد اختلاف پسند و فرقہ پرست طبائع نے اس کو اپنی تصنیفات میں درج کرنا شروع کردیا اور پھر اس کی تائید میں بعض تابعین و اتباع تابعین کے اقوال بھی بنا ڈالے۔

نصر مقدسی سب سے پہلے تو نصر مقدسی ہی کو دیکھئے کہ ان کا ذکر نہ امام ذہبی اپنی کسی کتاب رجال میں کرتے ہیں نہ ابن حجر، نہ طبقات ابن سعد میں ان کا کہیں ذکر ہے نہ انساب سمعانی میں۔ یہانتک کہ ان کی کتاب الحجۃ جس کا حوالہ جامع صغیر میں ہے اس کتاب کا ذکر کشف الظنون میں بھی نہیں۔ اندازے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سمعانی و ذہبی و ابن حجر سب سے متاخر ہیں لیکن جلال سیوطی متوفی ۹۱۱ھ ہی نہیں بلکہ علامہ ابراہیم بن عثمان الزرکشی الکاشغری متوفی ۷۴۵ھ بھی صرف انھیں کا حوالہ اس حدیث کے متعلق دیتے ہیں۔ اسلئے یہ اگر علامہ زرکشی سے متقدم نہیں تو ان کے ہمعصر ضرور ہیں۔ یعنی ۷۴۵ھ سے پہلے یا شاید کچھ بعد ان کی وفات ہوا اس لئے سمعانی نہیں تو امام ذہبی اور حافظ ابن حجر کو تو ضرور ان کا ذکر کرنا تھا۔ سمعانی کی وفات ۵۶۲ھ میں ہے لیکن ذہبی کی وفات ۷۴۳ھ میں ہے اور ابن حجر کی وفات تو ۸۵۲ھ میں ہوئی ہے یہ تو نویں صدی کے ہیں، ذہبی بھی زرکشی کا ذکر کرتے ہیں، اور ابن حجر بھی۔ مگر جس کی کتاب کا حوالہ زرکشی اپنی کتاب میں دیتے ہیں اور اس کو اپنا معتمد علیہ سمجھتے ہیں، جو ان سے کچھ متقدم یا ان کا ہم عصر معتمد علیہ ہے اس کا ذکر نہ ذہبی کرتے ہیں نہ ابن حجر۔ آخر اس کی کوئی وجہ ہونی چاہئے۔

قاضی حسین اصل یہ ہے کہ سب سے پہلے جن صاحب نے دنیا کو اس گمراہ کن قول سے حدیث رسول قرار دے کر روشناس کرایا وہ قاضی حسین صاحب تھے جیسا کہ جامع صغیر میں قاضی حسین اور امام الحرمین کا ذکر کیا ہے کہ ان دونوں نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ یہ قاضی صاحب کون تھے؟ اس کو بھی سن لیجئے۔ باوجود اس کے کہ یہ چوتھی صدی کے بزرگ ہیں یعنی قاضی حسین کی وفات ۴۳۳ھ کی ہے ان کا ذکر امام ذہبی متوفی ۷۴۸ھ اور ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ اپنی کتابوں میں نہیں فرماتے۔ البتہ ابو محمد عبداللہ بن اسعد الیافعی متوفی ۷۶۸ھ اپنی کتاب مرآۃ الجنان میں اور عبدالکریم بن اسمعانی کتاب الانساب میں اور نواب صدیق حسن خاں اتحاف النبلاء میں ان کا

مختصر ذکر کرتے ہیں یعنی ان کا نام حسین بن اسمٰعیل بن محمد اور ابو عبداللہ کنیت ہے۔ ۹۵ برس کی عمر پائی۔ ساٹھ برس تک مسلسل کوفہ کے قاضی رہے۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اتحاف النبلاء میں ان کو "طیبی" لکھا ہے۔ اتحاف النبلاء پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمہ اللہ نے زبردست نکتہ چینی اپنے رسالہ "ابراز الغی" میں کی ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ان کی نظر بھی اس پر نہیں پڑی۔ انساب سمعانی میں طَیبی اور طِیبی یعنی بالفتح و بالکسر دو نسبتوں کا ذکر کیا ہے بالفتح ابوطیبہ عیسیٰ بن سلیمان کی اولاد دوم "طیب" ایک شہر تھا واسط اہواز کے درمیان اس کے رہنے والے مگر قاضی حسین کو ان دونوں نسبتوں سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ درحقیقت بنی ضَبَّہ سے تھے۔ اس لئے ان کو ضبی لکھتے ہیں۔ چنانچہ سمعانی نے ان کے والد اسمٰعیل بن محمد بن ابان المحاملی الضبی کا ذکر لفظ ضبی کے تحت میں کیا ہے۔ اور خود ان کا نام محاملی کے تحت میں کیا ہے پہلے ان کے بھائی ابوعبید اللہ قاسم کا نام لکھا ہے پھر ان کا نام ابوعبداللہ حسین بن اسمٰعیل بن سعید بن ابان لکھا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ وہاں تو اسمٰعیل بن محمد بن ابان لکھتے ہیں اور یہاں اسمٰعیل بن سعید بن ابان لکھ رہے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم بھی اسمٰعیل بن محمد ہی لکھتے ہیں۔ مراۃ الجنان میں ان کو ضبی المحاملی تو لکھا ہے مگر ان کے دادا کا نام ہی نہیں لکھا۔ غالباً "سعید" غلط ہے "محمد" ہی صحیح ہے۔ بہرحال ان کے دادا ان کے والد ان کے بھائی سب کوفی تھے۔ اور یہ بھی کوفے میں پیدا ہوئے اور کوفے ہی میں برابر رہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ دین اسلام میں جو فتنہ بھی اٹھا وہ عموماً کوفہ ہی سے اٹھا ہے۔ الا ماشاء اللہ! چنانچہ اس گمراہ کن قول کو رسول اللہ صلعم کی طرف نسبت دینے کی ابتدا بھی کوفے ہی سے ہوئی۔

باقی رہے امام الحرمین یعنی ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ بن یوسف ضیاء الدین الشافعی متوفی ۴۷۸ھ ہیں۔ ان کی تصنیفات میں رسالہ نظامیہ، مغیث الخلق لاتباع الحق، البرہان فی اصول الفقہ اور الارشاد فی الکلام مشہور کتابیں ہیں۔ ان میں سے کسی کتاب میں امام الحرمین نے "اختلاف امتی رحمۃ" کو حدیث رسول قرار دیکر کسی جگہ بھی نقل نہیں کیا ہے۔ اور بالفرض اگر امام الحرمین نے اپنی کسی کتاب میں کہیں اس قول کا ذکر کر بھی دیا ہو تو قاضی حسین ہی کی تحریر سے متاثر ہو کر ان کے اعتماد پر لکھ دیا ہوگا جس طرح خود جلال الدین سیوطی قاضی حسین اور امام الحرمین کے نام تو لکھ رہے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے اپنی کس کتاب میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے اگر جانتے ہوتے تو ضرور ان کی ان کتابوں کے نام بتائے ہوتے جس طرح نصر مقدسی کی کتاب کا نام بیہقی کی کتاب کا نام بتایا۔ قاضی حسین اور امام الحرمین کی کتابوں کے نام کا ذکر نہ کرنا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ حافظ سیوطی نے کسی سے سن کر ایسا لکھ دیا تھا۔

اور حلیمی یعنی ابوعبداللہ الحسین بن الحسن بن محمد بن حلیم الجرجانی الشافعی۔ یہ نیساپور میں پیدا ہوئے ۳۳۸ھ میں اور یہیں تعلیم پائی یہیں پروان چڑھے اور پھر یہیں حدیث کی اشاعت کرتے رہے ۴۰۳ھ میں وفات پائی۔ نیشاپور کو تو آپ خوب جان چکے ہیں جو جھوٹی حدیثوں کی خاص اشاعت گاہ تھی۔ اس لئے اگر ان کو یہاں یہ حدیث کسی سے مل گئی ہو یا قاضی حسین ہی کی تحریر سے مل گئی ہو تو کیا تعجب ہے؟ مگر تعجب یہ ضرور ہے کہ یہ سب کے سب بغیر کسی سند کے بغیر راویوں کے سلسلۂ اسناد کے بغیر راوی صحابی کے ذکر کے اس گمراہ کن قول کو حدیث رسول تسلیم کر کے آخر اپنی کتابوں میں کس طرح لکھ گئے۔ اسی طرح بیہقی حافظ احمد بن الحسین الشافعی متوفی ۴۵۸ھ نے بھی اپنے رسالہ اشعریہ میں اس کا ذکر حدیث کی حیثیت سے کر دیا۔ اگرچہ قول ضعیف قرار دیکر یعنی رُوِیَ کہکر۔ شارح صاحب نے سبکی و دیلمی کا

بھی ذکر کر دیا۔ دیلمی ابو شجاع الہمدانی متوفی ۵۰۹ھ جن کی مسند الفردوس مشہور ہے۔ اور سبکی تقی الدین علی بن عبدالکافی الشافعی متوفی ۷۵۶ھ (بعضوں نے ۷۷۳ھ ان کا سال وفات لکھا ہے)۔

سیوطی کی توضیح جلال سیوطی ان لوگوں کا نام لکھ کر خود لکھتے ہیں کہ ولعلہ خرج فی بعض کتب الحفاظ التی لم تصل الینا یعنی شاید اس حدیث کی تخریج بعض حافظوں کی ان کتابوں میں کی گئی ہو جو ہم لوگوں تک نہیں پہنچیں۔ یہ لکھ کر حافظ سیوطی نے اس کانٹے کو نکالنا چاہا ہے جو خود ان کے اور ہر ایک انصاف پسند کے دل میں کھٹکتا ہے کہ اگر یہ واقعی حدیث رسول ہے تو کس صحابی نے اس کی روایت کی؟ اور پھر صحابی کے بعد والے راوی کون کون ہیں؟ اور پھر دوسری یا تیسری صدی کے کس شیخ الحدیث نے اس کو اپنی کتاب میں اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے؟ تو یہ ایک کانٹا جس کی تین تین نکیلی نشتر نما شاخیں ہیں، اس کے نکالنے کی یہ سبیل نکالی کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ بعض حفاظ حدیث نے اس کو اپنی کتاب میں ضرور صحابی کے نام اور سلسلہ اسناد کے ساتھ روایت کیا ہوگا مگر وہ کتاب ہم لوگوں تک نہیں پہنچ سکی اسلئے ہم لوگ نہ اس کے سلسلۂ اسناد سے واقف ہو سکے نہ اس کے راوی صحابی کے نام سے آگاہ ہو سکے۔ اگر فرضی دوہی طریقے سے یہ سہ شاخہ زبردست کانٹا اس آسانی سے نکل جا سکتا ہے تو پھر سارے موضوعات کے دفتر کو بھی صحاح کا لقب دیا جا سکتا ہے اور ہر موضوع و مکذوب حدیث کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ حدیث عالی اسناد سے کسی حافظِ حدیث نے اپنی کتاب میں روایت کی ہو اور وہ کتاب ہم لوگوں تک نہ پہنچی ہو۔

اس حدیث کی ضرورت اصل یہ ہے کہ تیسری صدی تک مسلمانوں میں دینی اختلافات بہت کافی حد تک پھیل چکے تھے فرقہ بندیاں قائم ہو چکی تھیں قرآن مبین میں اختلافات پیدا کرنے کی صریح ممانعتیں موجود تھیں اور دین میں اختلاف پیدا کرنا اہل بغی کا کام بتلایا گیا تھا۔ فرقہ بندی کی ممانعت اسقدر سخت تھی کہ اس کو شرک قرار دیا گیا۔ ان حالات میں اختلاف پسند طبائع اور فرقہ پرست عناصر کے لئے کوئی سہارا اپنے اختلافات کو برقرار رکھنے کا مل نہیں رہا تھا، ایسے بے بسی کے وقت میں جو گمراہ کن قول حدیث رسول کے نام سے قاضی حسین یا ان سے پہلے کسی نے پیش کر دیا تو پھر ان لوگوں کو بہت بڑا سہارا مل گیا، چاہے وہ ایک تنکا بلکہ ایک تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ نہ انھوں نے اس کی پروا کی کہ اس کے راوی صحابی کا تو پتہ ہی نہیں ہے نہ اس کی پروا کی کہ دوسری تیسری صدی میں کسی جامع احادیث نے اس گمراہ کن قول کو حدیث رسول کہہ کر اپنی کتاب میں داخل نہیں کیا مگر تھی یہ ان کے کام کی اور ان کے جی کی بات اس لئے فوراً دانتوں سے اس کو پکڑ لیا۔ مگر محدث خود سے اس کیلئے اسناد گھڑ نہیں سکتے تھے، نہ اپنے جی سے کسی صحابی کی طرف اسکو منسوب کر سکتے تھے۔ اسلئے بیہقی نے رسالہ اشعریہ میں تو ایک قول ضعیف تراردیکر رُوِیَ کے ساتھ اس کا ذکر کر دیا مگر اپنی حدیث کی کتابوں میں خصوصاً سنن کبری میں اس کا مطلق ذکر نہ کیا۔

شارح جامع صغیر نے اور کمال کیا۔ سیوطی نے جو لکھا کہ "شاید بعض حفاظ حدیث کی کتابوں میں اس حدیث کی تخریج کی گئی ہو اور وہ کتابیں ہم لوگوں تک نہ پہنچ سکیں تو شارح صاحب نے اس گرتی دیوار پر ایک کھوکھلا پشتہ لگانے کی کوشش یوں فرمائی کہ لکھتے ہیں کہ "بات بھی یونہی ہے۔ چنانچہ بیہقی نے اپنی کتاب مدخل میں اور دیلمی ابو شجاع الہمدانی متوفی ۵۰۹ھ نے اپنی کتاب الفردوس میں

اس کی اسناد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف کی ہے۔ اس کے بعد پھر خود ہی مجوزؒ تحریر فرماتے ہیں کہ "لیکن (بیہقی نے مدخل میں اور دیلمی نے فردوس میں) اختلاف اصحابی رحمۃ کے لفظوں کے ساتھ" یعنی ان دونوں نے جو حدیث ابن عباس سے روایت کی ہے وہ اختلاف امتی رحمۃ تو نہیں ہے مگر اختلاف اصحابی رحمۃ ہے پھر آخر میں شارح صاحب اتنا اعتراف کرکے یہ بحث ختم کرتے ہیں کہ قال الشیخ حدیث ضعیفؒ یعنی شیخ نے فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ یعنی یہ اختلاف اصحابی رحمۃ بھی باوجود حضرت ابن عباس کی طرف منسوب ہونے کے حدیث ضعیف ہی ہے۔ اس کی وجہ شارح صاحب نے نہیں لکھی کہ یہ حدیث بھی ضعیف ہی کیوں ہے۔ اس کی تصریح آگے آتی ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ "قال الشیخ حدیث ضعیف" اختلاف امتی رحمۃ والی حدیث کے متعلق لکھا ہو، پہلی عبارت کی شرح بطور جملہ معترضہ بیان کرنے کے بعد پھر اوپر ہی کے سلسلے کی بات بیان کی ہو۔ اسی لئے ہم نے پہلے قال الشیخ حدیث ضعیف کو اختلاف امتی رحمۃ ہی کے متعلق قرار دیا ہے۔ مگر چونکہ جو لوگ ان دونوں حدیثوں کو موضوع و کذب و افترا نہیں کہتے ان سبھوں کے نزدیک یہ دونوں حدیثیں ضعیف تو ضرور ہیں اس لئے یہ قول دونوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اختلاف امتی تو محض ایک قول بے سند ہے اس لئے اس کا ضعف ظاہر ہے مگر اختلاف اصحابی بھی باوجود اس کی اسناد مذکور ہونے کے ضعیف ہی ہے اس کا اعتراف بھی تمام محدثین کو ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ اسلئے یہ نہ کہئے کہ پہلے تو قال الشیخ حدیث ضعیف کو اختلاف امتی سے متعلق قرار دیا اور اب یہاں اختلاف اصحابی والی حدیث سے متعلق قرار دے رہے ہیں۔ واقعہ یہی ہے کہ اس کے متعلق کہیں جب بھی صحیح ہے اور اس کے متعلق کہیں جب بھی صحیح ہے۔

یہ بھی آپ معلوم فرمالیں کہ یہ شرح جامع صغیر کونسی ہے اور شارح کا نام کیا ہے؟ اس شرح کا نام السراج المنیر ہے اور شارح علی بن احمد بن نورالدین محمد بن ابراہیم العزیزی متوفی ۱۰۴۳ھ ہیں۔

علامہ السخاوی

جامع صغیر و شرح جامع صغیر ج ۱ ص ۴۸ میں اس حدیث کی جو بحث تھی وہ تو آپ ملاحظہ فرماچکے۔ اب ایک دوسری کتاب کی بھی سیر فرمالیجئے۔ علامہ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی متوفی ۹۰۲ھ اپنی کتاب "المقاصد الحسنۃ فی الاحادیث المشہورۃ علی الالسنۃ" کے ص۲۶ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "البیہقی فی المدخل من حدیث سلیمان بن ابی کریمۃ عن جویبر عن الضحاک عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مھما اوتیتم من کتاب اللہ فالعمل بہ لا عذر لاحد

---

[1] یہ حدیث چونکہ جویبر کوفی نے وضع کی تھی اسلئے شیعہ مذہب کے بعض متاخرین کی کتابوں میں موجود ہے چنانچہ علامہ باقر مجلسی مشہور شیعہ محدث نے اپنی کتاب "بحارالانوار" جلد اول ص۱۸۸ میں تھوڑے سے لفظی ردوبدل کے ساتھ ثمامہ طبرسی کی کتاب الاحتجاجات سے بروایت امام جعفر صادق یہ حدیث نقل کی ہے، مگر انھوں نے بھی اسناد کا ترک ہی مناسب خیال کیا۔ امام جعفر صادق سے شیخ طبرسی تک کتنے راوی تھے اور کون کون تھے کچھ نہیں معلوم۔ اور امام جعفر صادق اور رسول اللہ صلعم کے درمیان کون کون بزرگ تھے؟ اس کے پوچھنے کی انھیں کوئی ضرورت ہی نہیں۔ کسی امام کا صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قال رسول اللہ صلعم لیکن شیعیت کی مناسبت سے آخر میں اتنا اضافہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اختلاف اصحابی رحمۃ میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہو تو آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کے اصحاب کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ میرے اہل بیت۔ اس کے بعد علامہ مجلسی لکھتے ہیں کہ محمد بن الحسن بن بابویہ القمی نے کہا کہ اہل بیت باہم اختلاف نہیں کرتے ہیں مگر وہ شیعوں کیلئے فتوی دیتے ہیں حق جو تلخ ہوتا ہے اور بسا اوقات انھیں فتوے دیتے ہیں تقیہ کرکے تو ان کے اقوال میں جو اختلاف ہوتا ہے وہ تقیہ کے سبب سے ہوتا ہے والتقیۃ رحمۃ للشیعہ اور تقیہ شیعوں کیلئے رحمت ہے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

فی ترکہ۔ فان لم یکن فی کتاب اللہ فسنۃ منی ماضیۃ، فان لم تکن سنۃ منی فما قال اصحابی۔ ان اصحابی بمنزلۃ النجوم فی السماء فایما اخذتم بہ اھتدیتم۔ واختلاف اصحابی لکم رحمۃ۔ ومن ھذا الوجہ اخرجہ الطبرانی والدیلمی فی مسندہ بلفظ سواء۔ وجویبر ضعیف جداً والضحاک عن ابن عباس منقطع۔ وقد عزاہ الزرکشی لی کتاب الحجۃ لنصر المقدسی مرفوعاً من غیر بیان لسندہ ولا صحابتہ وکذا عزاہ العراقی لآدم بن ابی ایاس فی کتاب العلم والحکم بدون بیان بلفظ "اختلاف اصحابی رحمۃ لامتی" قال ھو مرسل ضعیف۔ وبھذا اللفظ ذکرہ البیھقی فی رسالتہ الاشعریۃ بغیر اسناد۔ وفی المدخل لہ من حدیث سفیان عن افلح بن حمید عن القاسم بن محمد قال اختلاف اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ لعباد اللہ۔ یعنی سخاوی شروع میں تو لکھتے ہیں "حدیث اختلاف امتی رحمۃ" مگر اس کے بعد جو کچھ لکھتے ہیں وہ اختلاف اصحابی کے متعلق ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "بیہقی نے مدخل میں سلیمان بن ابی کریمہ کی حدیث جویبر سے وہ ضحاک سے وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ جب تک تم پاتے رہو اللہ کی کتاب سے (احکام) تو اسی پر عمل کرتے رہو، کسی کو اس کے ترک کرنے کیلئے کسی عذر کی گنجائش نہیں تو اگر (وہ مسئلہ) کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو میری سنت جو چلی آرہی ہے (اس میں ڈھونڈھو) اگر میری سنت میں بھی (وہ مسئلہ) نہ ملے تو جو کچھ میرے صحابہ کہیں۔ کیونکہ میرے صحابہ بمنزلہ ستاروں کے ہیں آسمان پر۔ (یعنی جس طرح آسمان پر ستارے ہیں اسی طرح صحابہ زمین پر ہیں) تو ان میں سے) جس کو بھی تم نے اتباع کے لئے لیا تم نے ہدایت پالی۔ اور میرے صحابہ کا باہمی اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے۔ اور اسی صورت سے اس حدیث کو طبرانی اور دیلمی نے اپنے مسند میں روایت کیا ہے یکساں الفاظ سے۔ مگر جویبر ضرور ضعیف راوی ہیں۔ اور ضحاک کی روایت حضرت ابن عباس سے منقطع ہے اور زرکشی نے اس کی نسبت کتاب الحجہ کی طرف کی ہے جو نصر مقدسی کی کتاب ہے مرفوعاً یعنی رسول اللہ صلعم کا قول قرار دے کر، لیکن بغیر سند بیان کئے اور بغیر اس کے راوی صحابی کا نام بتاتے ہوئے۔ اور اسی طرح عراقی نے اس حدیث کی نسبت کی ہے کتاب العلم والحکم میں آدم بن ابی ایاس کی طرف بغیر اسناد اور صحابی کا نام بیان کئے، ان لفظوں میں کہ "اختلاف اصحابی رحمۃ لامتی" اور کہا کہ یہ حدیث ایک ضعیف مرسل ہے اور انھیں لفظوں سے اس حدیث کا ذکر بیہقی نے اپنے رسالہ الاشعریہ میں کیا ہے بغیر اسناد کے۔ اور بیہقی ہی نے مدخل میں سفیان کی حدیث لکھی ہے جس کو سفیان افلح بن حمید سے وہ قاسم بن محمد سے روایت کرتے ہیں، کہ انھوں نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا اختلاف ایک رحمت ہے اللہ کے بندوں کے لئے۔

اختلافِ صحابہؓ

آخری حدیث جو سفیان ثوری سے مروی ہے وہ حدیث رسول نہیں بیان کی گئی ہے بلکہ قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق رضؓ متوفی ۱۰۶ھ کا ذاتی قول ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا۔ اور اس کے بعد اور بھی بعض تابعین کے اقوال لکھے ہیں جن پر میں بعد کو بحث کروں گا۔

مجھ کو دکھانا یہ ہے کہ درحقیقت اختلاف امتی رحمۃ کو حدیث رسول قرار دے کر کسی نے بھی نہیں لکھا ہے۔ نہ نصر مقدسی نے کتاب الحجہ میں نہ بیہقی نے رسالہ اشعریہ یا مدخل میں لکھا ہے اور نہ طبرانی و دیلمی نے لکھا ہے جن کے حوالے جامع صغیر میں منقول ہیں۔ سخاوی صاف طور سے لکھ رہے ہیں کہ ان سبھوں نے اختلاف اصحابی ہی کی روایت نقل کی ہے چاہے بغیر سند اور بغیر ذکر

صحابی کے لکھی ہو چاہے ابن عباس کی طرف سلیمان بن ابی کریمہ و جویبر و ضحاک کے سلسلہ اسناد کے ذریعے منسوب کر کے ان میں سے کوئی بھی اختلاف امتی روایت نہیں کرتا۔ سخاوی نے صاف طور سے بحوالہ زرکشی بتا دیا کہ نصر مقدسی نے بھی اختلاف اصحابی ہی کو لکھا ہے، اس کو بھی بیان کر دیا کہ بیہقی کے رسالہ اشعریہ اور مدخل دونوں میں اختلاف اصحابی ہی ہے دیلمی کے متعلق بھی واضح کر دیا کہ ان کی مسند فردوس میں بھی اختلاف اصحابی ہی ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کتاب میں بھی کسی جگہ اختلاف امتی کا لفظ ہوتا تو سخاوی ضرور لکھتے۔ خصوصاً جب وہ شروع میں اختلاف امتی رحمۃ کو حدیث قرار دیکر لکھ چکے تھے۔ باقی رہ گئے قاضی حسین، حلیمی اور سبکی اور امام الحرمین کو بھی لے لیجئے۔ تو اگر واقعی ان لوگوں نے اپنی کسی کتاب میں اختلاف امتی رحمۃ کو حدیث نبوی کی حیثیت سے لکھا ہوتا تو سخاوی ان لوگوں کا اور ان کی ان کتابوں کا جن میں اس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے ضرور ذکر کرتے۔ سخاوی اور سیوطی بالکل ہم عصر تھے۔ سخاوی کے سات برس بعد سیوطی کی وفات ہوئی ہے۔ سخاوی سے قاضی حسین، حلیمی، امام الحرمین اور سبکی کی تصنیفات پوشیدہ نہ تھی۔ اسلئے یقیناً ان لوگوں کی کتابوں میں اختلاف امتی رحمۃ ہے ہی نہیں، ان لوگوں نے بھی لکھا ہوگا تو اختلاف اصحابی رحمۃ ہی لکھا ہوگا۔ یا کچھ بھی نہ لکھا ہو۔ بلکہ زیادہ قرینہ یہی ہے کہ ان دو میں سے کوئی قول بھی ان لوگوں کے کتابوں میں منقول ہی نہ ہو۔ ورنہ سخاوی ان لوگوں کو ہرگز نظر انداز نہ کرتے۔ خصوصاً جب کہ یہ لوگ متقدم ہیں باعتبار بعض مذکور ہی کے اور قاضی حسین تو ان سب سے متقدم ہیں جن کے نام جامع صغیر و مقاصد حسنہ میں اس سلسلہ میں آئے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ قاضی حسین کی اس تصنیف کا ذکر ہے جس میں انھوں نے اس حدیث کو لکھا ہے نہ حلیمی کی تصنیف کا نہ امام الحرمین کی تصنیف کا اور نہ سبکی کی تصنیف کا اور جن لوگوں نے اختلاف امتی نہ ہی اختلاف اصحابی ہی والی حدیث ہی اپنی کسی کتاب میں بلا سند یا کسی سند کے ساتھ لکھی تھی ان کے نام کے ساتھ ان کی اس کتاب کا بھی ذکر جامع صغیر میں موجود ہے۔ دیکھئے نصر مقدسی کی کتاب الحجۃ، بیہقی کے رسالہ اشعریہ اور مدخل دونوں کا ذکر تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ شارح جامع صغیر نے وغیرہم کے شرح میں دیلمی اور سبکی کے نام تو لکھ دیئے مگر یہ نہیں بتایا کہ قاضی حسین و امام الحرمین و حلیمی و سبکی نے اپنی کن کن کتابوں میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ شارح کا یہ ایک فریضۂ منصبی تھا وہ سیوطی کے بتائے ہوئے محدثین کی کتابوں کے نام کیا بتاتے کہ خود سبکی کا نام صرف لکھ گئے مگر سبکی کی اس تصنیف کا نام نہیں بتایا جن میں سبکی نے یہ حدیث لکھی ہے۔ سبکی کی طبیعت سے وہ واقف تھے، قرینے سے سمجھ گئے کہ سبکی نے ضرور یہ حدیث نقل کی ہوگی اس لئے سبکی کا نام بھی دیلمی کے ساتھ لکھ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حافظ جلال الدین سیوطی کا علم و فضل اور ان کا تقویٰ و ورع خاص کے دینی امور میں اس سے بہت بلند ہے کہ وہ ایک جھوٹی حدیث کو زبردستی سچی ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ واقعہ در اصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث جامع صغیر میں داخل کر دی گئی ہے، جبھی تو اس طرح کی کمزوریاں اس میں نظر آ رہی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

قرینہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جویبر بن سعید الازدی الکوفی متوفی ۱۵۲ھ نے اس حدیث کو وضع کیا جس کا ذکر المقاصد الحسنہ میں سخاوی نے کیا ہے اور میں نے پوری عبارت نقل کر کے اس کا

ترجمہ بھی آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ پوری حدیث فلسفہ لغیات کے ماتحت بنائی گئی ہے کہ جس مسئلے کے متعلق شریعتِ اسلامیہ کا حکم دریافت کرنا ہو سب سے پہلے قرآن مبین میں ڈھونڈھو، جب تک مسائل کے جوابات قرآن میں ملتے رہیں کسی اور طرف نظر دوڑانے کی ضرورت نہیں اور نہ قرآنی حکم چھوڑ دینے کے لئے کوئی عذر، کوئی حیلہ حوالہ نکالنے کی گنجائش ہے۔ ہاں کسی مسئلے کا جواب صریح طور سے قرآن میں نہ ملے تو پھر سنتِ رسول میں تلاش کرو۔ سنتِ رسول بھی نہ ملے تو اقوالِ صحابہ میں ڈھونڈھو۔ کیونکہ روئے زمین پر صحابہ کی حیثیت وہی ہے جو حیثیت آسمان پر ستاروں کی ہے۔ ان میں سے جن کو بھی تم نے پالیا اور جن کا قول بھی تمہیں مل گیا اور تم نے ان کا اتباع کیا تو ہدایت پا گئے۔

یہاں تک تو جویبر صاحب نے ایسی بات کہی جو عام طور پر مانی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد کہا کہ واختلاف اصحابی لکم رحمۃ۔ یعنی آخر میں آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "اور میرے صحابہ کا باہمی اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے"۔ اس گمراہ کن قول کو ایسے موقع سے رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے کہ پہلے اقوال کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد عقل ظاہر بیں خواہ مخواہ اس قول کو بھی صحیح ہی تسلیم کریگی۔ کیونکہ صحابہ عہدِ نبوی و عہدِ خلفائے راشدین میں مختلف ملکوں میں عامۂ مسلمین کی تعلیم کے لئے امیر بنا کر بھیجے جاتے تھے تو ان دور دور کے ملکوں میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی جیسی صورت مسئلہ متعدد جگہ پیش آئی اور ان متعدد صحابہ نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مختلف طریقے سے اجتہاد کیا اور مختلف جوابات اسی ایک صورت مسئلہ کے متعلق انھیں ان کے ذہنوں سے ملے اور وہ باہم مختلف احکام صادر کرنے پر مجبور ہوگئے اور اس حکم دینے کے وقت ایک صحابی کو دوسرے صحابی کے حکم کی کوئی خبر نہ مل سکی۔ بعد والوں کو اسی ایک صورتِ مسئلہ کے متعلق متعدد صحابہ کے باہم مختلف احکام ملتے ہیں[۱]۔ اس صورتِ حالات میں یہ وضع کردہ ٹکڑا آسانی سے فہم سکتا تھا۔

جویبر صاحب کا مقصود

دراصل واختلاف اصحابی لکم رحمۃ کا اضافہ کسی صحیح حدیث میں ایک اضافہ نہیں ہے بلکہ اسی اضافے کیلئے اوپر کا متعارف و مشہور مضمون بطور تمہید کے پہلے بیان کر کے عام مسلمانوں کے ذہنوں کو اس اضافے کے قبول کر لینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جویبر کا اصل مقصود اختلاف اصحابی لکم رحمۃ کو حدیثِ رسول ثابت کرنا تھا مگر وہ پہلے پہل صرف اسی کو قالِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہکر بیان کر دیتے تو کوئی شخص بھی اس کو قبول نہیں کرتا اور ہر سننے والا ان کو جھوٹا ہی کہتا۔ مگر چونکہ جویبر بن سعید ایک مشہور غیر ثقہ اور متروک الحدیث راوی تھے اسلئے صحاح ستہ والے ہی نہیں بلکہ تیسری صدی تک کے تمام محدثین نے ان کی ایسی من گھڑت حدیث کو قابلِ التفات نہیں سمجھا اور کسی نے بھی اس کو اپنی کتاب میں داخل نہ کیا اور اگر کسی سازشی نے کسی شیخ الحدیث کی کتاب میں اس کو داخل بھی کر دیا ہوگا تو اسی خلاف عقل اضافے کی وجہ سے نظر پڑتے ہی اس شیخ الحدیث نے پہچان لیا ہوگا کہ یہ حدیث میری کتاب میں داخل کر دی گئی ہے، میری لکھی ہوئی نہیں ہے کیونکہ یہ مضمون ہی بالکل نیا ہے جو کبھی کسی سے نہیں سنا گیا۔ اسی لئے سازشی منافقین کو اس کی متابعتوں کے بنانے کا بھی موقع نہ ملا اور اگر کسی نے کوئی متابعت بنائی بھی ہوگی تو وہ مقبول نہ ہو سکی اور رواج نہ پا سکی۔

جویبر کون ہیں؟

جویبر بن سعید الکوفی کا ذکر تنقید حدیث نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی چوتھی قسط میں دسمبر ۱۹۵۱ء کے طلوعِ اسلام میں آچکا ہے۔ مختصراً یہاں بھی سن لیجئے کہ یحییٰ بن سعید اور عبدالرحمٰن بن مہدی ان کو متروک الحدیث سمجھتے تھے اسلئے

---

[۱] اس کی تشریح کے لئے مضمون کا آخری حصہ ملاحظہ فرمائیے۔ (طلوعِ اسلام)

ان سے کبھی کوئی حدیث روایت نہیں کرتے تھے۔ یحییٰ بن معین ان کو ضعیف لیس بشیٔ کہتے تھے۔ علی بن المدینی کہتے ہیں کہ ان کے والد نے کہا کہ یہ تو قطعاً ضعیف ہیں۔ ضحاک سے بہت منکر حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں۔ یعقوب بن سفیان نے ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے جن کی روایت کرنا جائز نہیں۔ نسائی، علی بن الجنید اور دارقطنی نے ان کو متروک الحدیث قرار دیا ہے اور نسائی نے غیر ثقہ بھی کہا ہے۔ ابن عدی نے کہا کہ ضعف تو ان کی حدیثوں پر چھایا ہوا ہے۔ ابن حبان نے کہا کہ اس نے ضحاک سے الٹی پلٹی حدیثیں روایت کی ہیں۔ ابو احمد الحاکم نے کہا کہ یہ گئی گذری حدیث والے ہیں اور ابو عبداللہ الحاکم نے کہا کہ میں ان کی ذمہ داری سے اللہ کے سامنے اپنی برارت کا خواستگار ہوں۔ کم و بیش ۱۰۵ھ میں ان کی وفات ہے۔ تہذیب التہذیب اور لسان المیزان وغیرہ میں ان کا تفصیلی حال موجود ہے اور یہ بھی مذکور ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان نے فرمایا کہ لوگوں نے تفسیری روایتوں کے لینے میں تساہل سے کام لیا، کہ ایسے لوگوں سے تفسیریں جن کو وہ حدیثوں کے لینے کے وقت قابل وثوق نہیں سمجھتے مثال کے طور سے ضحاک، جویبر اور محمد بن السائب الکلبی کے نام لئے اور فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی حدیثیں قبول نہیں کی جاتیں، مگر ان کی بیان کردہ تفسیریں قبول کر لی جاتی ہیں۔ دیکھئے تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۳۴

ضحاک بن مزاحم

اسی ضمن میں ضحاک بن مزاحم کا حال بھی آپ کو معلوم ہو چکا کہ یحییٰ بن سعید القطان نے جویبر بن سعید اور محمد بن السائب الکلبی کے ساتھ ضحاک کا ذکر کر کے یہ بھی بتا دیا کہ یہ بھی انھیں دونوں جیسے ہیں اور ان کی بھی تفسیر قبول جاتی ہے مگر ان کی حدیثیں قبول نہیں کی جاتیں مگر بہتر ہے کہ مختصر طور سے ان کا حال بھی سن لیجئے مگر اتنا ذہن میں رہے کہ ضحاک بن مزاحم صاحب خالص خراسانی تھے۔

ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۴۵۴ میں لکھتے ہیں کہ امام شعبہ ضحاک سے روایت نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ضحاک نے ابن عباسؓ سے کبھی ملاقات نہیں کی اور یحییٰ بن سعید نے کہا کہ ضحاک ہم لوگوں کے نزدیک ضعیف تھے اور ابن حبان نے کہا کہ تابعین کی ایک جماعت سے ضرور ملاقات کی مگر صحابی سے ان کی لقا ثابت نہیں۔ ابن عدی نے کہا کہ یہ صرف تفسیر کے متعلق معروف ہیں مگر ابن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ سے یہ جو کچھ روایت کرتے ہیں وہ سب محل نظر ہیں۔ عبدالملک بن میسرہ نے کہا کہ انھوں نے ابن عباسؓ سے ہرگز ملاقات نہیں کی۔ مشاش[1] نے کہا کہ انھوں نے ابن عباسؓ کو دیکھا تک نہیں ۱۰۵ھ یا ۱۰۶ھ میں وفات پائی۔ اتنی تفصیل کے بعد آپ اس روایت کو بھی دیکھ لیجئے کہ ضحاک صاحب حضرت ابن عباسؓ ہی سے اس حدیث کی روایت کر رہے ہیں۔

مگر میں جانتا سمجھتا ہوں اس میں قصور غریب ضحاک کا نہیں ہے بلکہ جویبر بن سعید، عبدالعزیز بن ابی رواد، ابو خباب یحییٰ بن ابی حیہ الکلبی وغیرہم کا ہے جن لوگوں نے حدیثیں بنائیں اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب کیں اور غریب ضحاک کے سر تھوپ دیں۔ اسی لئے جب ضحاک سے عبدالملک نے پوچھا کہ تم نے ابن عباسؓ سے کچھ سنا ہے؟ تو ضحاک نے کہا کہ نہیں۔ مگر ان کے کوفی متبعین اس کا شور مچاتے رہے کہ ضحاک نے ابن عباسؓ سے حدیثیں سنی ہیں۔ چنانچہ ابو خباب کلبی نے کہا کہ ضحاک نے کہا کہ میں ابن عباسؓ کے پڑوس

---

[1] مشاش ابو سامان الخراسانی یہ ضحاک کے ہموطن بھی تھے اور شاگرد بھی اور محدثین ان کو ثقہ لکھتے ہیں اسلئے ابو خباب الکوفی الکلبی جو غیر ثقہ متروک الحدیث مدلس تھے ان سے زیادہ یہ مشاش الخراسانی قابل اعتبار تھے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

میں سات برس تک رہا ہوں (شاید بچپن میں سات برس تک پڑوس میں رہے ہوں مگر نہ ان سے کچھ سننے کا موقع ملا نہ ان کو دیکھنے کا کبھی موقع ملا۔ یہ بھی اس وقت کہا جا سکتا ہے کہ شاید بچپن میں دیکھا ہو جبکہ ضحاک خراسان سے اس عمر میں مدینے یا کوفے میں آئے ہوں؟)

تو آپ اس جویبر والی حدیث کو جس میں ایک تمہید کے ساتھ اختلاف اصحابی رحمۃ والا مضمون ادا کیا گیا اس کے مفہوم اور اس کے راویوں کے حالات جان کر پوری طرح سمجھ گئے کہ یہ حدیث کیسی ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا کہ اختلاف اصحابی رحمۃ ایک ایسا مفہوم ہے کہ جویبر کے سوا کبھی کسی نے اس مضمون کی کوئی حدیث کسی صحابی سے نہیں روایت کی اور نہ کسی حدیثیں گھڑنے والے کی یہ ہمت پڑی کہ اس مضمون کی کوئی حدیث گھڑ کر کسی محدث کی کتاب میں داخل کر دے۔

سلیمان شامی

جویبر کی اس حدیث کا بھی قاضی حسین متوفی ۳۳۰ھ سے پہلے کبھی کسی نے نہ اپنی کسی کتاب میں ذکر کیا اور نہ سلیمان بن ابی کریمہ کے سوا اور کسی نے جویبر سے اس حدیث کو لیا اور سلیمان بن ابی کریمہ شامی تھے اور اپنے استاد جویبر کے پورے شاگرد تھے، یعنی یہ بھی ضعیف الحدیث و منکر الحدیث ہی تھے ان کا ترجمہ ابن حجر نے لسان المیزان ج ۳ ص۱۰۲ میں مفصل طور سے لکھ دیا ہے اور سلیمان بن ابی کریمہ کے بعد کا نام کسی نے لکھا ہی نہیں ہے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ سلیمان بن ابی کریمہ سے کس نے سنا؟ اور نہ سلیمان بن ابی کریمہ کا سال وفات کسی نے لکھا ہے مگر یہ دوسری صدی کے اواخر کے آدمی تھے۔ ممکن ہے کہ تیسری صدی کے اوائل میں ان کی وفات ہوئی ہو اسلئے نہ بیہقی متوفی ۴۵۸ھ ان سے سن سکتے تھے نہ طبرانی متوفی ۳۶۰ھ اور نہ دیلمی متوفی ۵۰۹ھ۔ ممکن ہے کہ سلیمان بن ابی کریمہ کے بعد بھی کچھ نام ہوں جن کا ذکر ضروری نہ سمجھا گیا۔ اور واقعی سلیمان بن ابی کریمہ جویبر بن سعید اور ضحاک بن مزاحم کے نام معلوم کر لینے کے بعد سلیمان کے بعد کے راویوں کا حال جاننا ضروری بھی نہ تھا مگر دوسری اور تیسری صدی کے اختلاف پسند طبائع کو اس کی فکر تھی کہ کسی طرح جویبر کی اس حدیث کو تقویت پہنچائی جائے تو وہ کوئی دوسری حدیث مہیا نہ کر سکے تو کم سے کم بعض تابعین کے اقوال ہی گھڑ لئے گئے۔ چنانچہ بیہقی متوفی ۴۵۸ھ نے سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ سفیان نے افلح بن حمید متوفی ۱۵۸ھ سے انھوں نے قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیقؓ متوفی ۱۰۲ھ سے سنا کہ انھوں نے (یعنی قاسم نے) کہا کہ اختلاف اصحاب محمد رحمۃ لعباد اللہ یعنی اصحاب محمد صلعم کا اختلاف اللہ کے بندوں کیلئے رحمت ہے۔ قاسم بن محمد ایک تابعی ہیں بیہقی اور سفیان ثوری کے درمیان تقریباً تین سو برس کا فاصلہ ہے اسلئے دونوں کے درمیان تین چار ناموں کی گنجائش ہے جب تک وہ تین چار نام نہ معلوم ہوں اس روایت کی حقیقت کس طرح معلوم ہو سکتی ہے۔ درحقیقت یہ سفیان ثوری پر ایک بہتان ہے۔

پھر اسی طرح قتادہ متوفی ۱۱۷ھ سے ایک روایت مقاصد حسنہ میں سخاوی متوفی ۹۰۲ھ بلا حوالہ نام کتاب لکھتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز متوفی ۱۰۱ھ فرماتے تھے کہ اگر اصحاب محمد صلعم آپس میں اختلاف نہ کرتے تو ہمیں اس کی خوشی نہ ہوتی کیونکہ اگر وہ لوگ باہم اختلاف نہ کرتے تو اتنی وسعتِ رخصت نہ ہوتی۔ یہاں بھی قتادہ اور سخاوی کے درمیان سات سو چاسی برس کا فاصلہ ہے۔ دونوں کے درمیان کتنے راوی ہوں گے آپ اندازہ کر سکتے ہیں جب تک ہر ایک کی وثاقت معلوم نہ ہو اس وقت تک اس روایت کے صدق و کذب کا حال کس طرح معلوم ہو سکتا ہے؟

سنن دارمی کی روایت

ہاں سنن دارمی میں ایک روایت اس قسم کی ہے جس کو دارمی نے یزید بن ہارون متوفی ۲۰۶ھ سے انھوں نے حماد بن سلمہ متوفی ۱۶۷ھ سے انھوں نے حمید الطویل متوفی ۱۴۳ھ سے سنا کہ انھوں نے بیان کیا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے کسی نے کہا کہ کاش سب لوگ ایک بات پر مجتمع ہوتے۔ تو عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کہ لوگ اختلاف نہ کرتے یہ میرے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں ہے۔ پھر انھوں نے تمام شہروں میں حکمنامہ بھیجدیا کہ تمام لوگ فقہاء کے متفق علیہ قول کے مطابق فیصلے کیا کریں۔ (سنن دارمی ج ۱ ص ۱۵۱ مطبوعہ دمشق)

سنن دارمی کا درجہ عام محدثین کے نزدیک صحاح ستہ کے بعد ہے۔ بعضوں نے اس کو ابن ماجہ کے عوض میں رکھکر صحاح ستہ میں داخل کیا ہے مگر عام محدثین نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ بہرحال جب بخاری و مسلم میں یارانِ طریقت نے من گھڑت حدیثیں رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کرکے داخل کردیں تو غریب ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الفضل بن بہرام الدارمی متوفی ۲۵۵ھ کی کتاب سنن دارمی جس کو متعدد محدثین نے مسند دارمی لکھا ہے۔ حالانکہ وہ مسند نہیں ہے (کیونکہ صحابہ کے ناموں سے اس کی ترتیب نہیں ہے بلکہ فقہی ابواب پر مشتمل ہے جس طرح بخاری و مسلم وغیرہ) یہ کیونکر لوگوں کی مداخلت سے محفوظ رہ سکتی تھی۔ اور یہ حدیث جو حدیثِ نبوی نہیں ہے بلکہ کسی صحابی کا بھی نہیں صرف ایک تابعی کا قول ہے، اگر سنن دارمی میں داخل نہیں کی گئی ہے تو دارمی کے شیخ یزید بن ہارون کی کتابوں میں تو ضرور داخل کی گئی کیونکہ ان کا کاتب جس کا نام بھی ہارون تھا وہ ان کی حدیثوں میں اپنی طرف سے حدیثیں داخل کردیا کرتا تھا، چنانچہ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۶۹ میں ہے کہ یہ اکثر اپنے مستملی یعنی کاتب سے کہا کرتے تھے کہ مجھ کو یہ خبر ہے کہ تو میری حدیثوں میں کچھ داخل کردیا کرتا ہے تو مجھ سے جو کوشش اس قسم کی ہوسکے کرتا رہ اللہ تیری نگہبانی نہ کرے، میں ۲۴ ہزار حدیثیں زبانی یاد رکھتا ہوں۔

یہ تو انھوں نے اپنے مستملی یعنی کاتب سے صرف کہدیا تھا مگر ان کے حافظے کا یہ حال تھا کہ ابن حجر خود اسی تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۶۹ میں لکھتے ہیں کہ ربما اذا سئل عن حدیث لا یعرفہ فیامر جاریتہ فتحفظہ من کتابہ یعنی جب وہ کسی ایسی حدیث کے متعلق پوچھے گئے جس کو انھوں نے نہیں پہچانا (کہ یہ ان کی حدیث ہے) تو حکم دیتے تھے اپنی لونڈی کو، وہ ان کی کتاب دیکھکر ان کو یاد دلایا کرتی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن حجر ان کے آغازِ ترجمہ ہی میں ص ۳۶۵ میں لکھتے ہیں کہ کان قد عمی یعنی یہ نابینا ہوگئے تھے۔ اور خود ان کی بصیرت فی الحدیث کے متعلق اسی کتاب کے ص ۳۶۸ میں ابن حجر لکھتے ہیں کہ یحیی بن معین کہتے تھے کہ یزید لیس من اصحاب الحدیث لانہ لا یمیز ولا یبالی عمن روی۔ یعنی یزید بن ہارون حدیث جاننے والوں میں سے نہ تھے۔ کیونکہ یہ تمیز نہیں کرتے تھے اور بے پروائی برتتے تھے کہ کس سے روایت کی ہے تو خیال فرمائیے کہ خود بصیرت فی الحدیث میں بھی کمزور، آنکھوں کی بصارت بھی ندارد۔ ان کا کاتب ایسا جو ان کی کتاب میں اپنی طرف سے خدا جانے کیا کیا داخل کردیا کرتا تھا۔ اس پر حافظہ ایسا کہ اس پر پورا اعتماد بھی نہیں۔ ورنہ ایسی کوئی حدیث جب پیش کی جاتی جس کو یہ اپنی حدیث کی حیثیت سے نہیں پہچانتے تھے تو اس سے انکار کردیتے نہ کہ اپنی لونڈی سے کتاب منگوا کر پڑھواتے اور جب وہ کتاب کی عبارت پڑھکر یاد دلاتی کہ آپ کی کتاب میں یوں لکھا ہوا ہے تو اس کو صحیح تسلیم کرکے روایت کرنے لگتے۔ ممکن ہے کہ وہ ان کے کاتب کی داخل کردہ ہو۔ غرض یہ روایت اگر سنن دارمی میں داخل کردہ نہیں ہے تو یزید بن ہارون، ان کی کتاب اور ان کے کاتب کے حالات کی روشنی میں سو فی صدی قرینے کی

روسے ضرور یزید بن ہارون کی کتاب میں ان کے کاتب کی داخل کردہ ہے۔

اور ایک روایت حضرت سخاوی متوفی ۹۰۲ھ لیث بن سعد متوفی ۱۷۵ھ سے نقل کرتے ہیں کہ یحیی بن سعید نے کہا کہ "اہل علم وسعت پیدا کرنے والے ہوتے ہیں مفتی لوگ ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں۔ یہ ایک چیز کو حلال قرار دیتا ہے تو دوسرا اسی کو حرام کہتا ہے، اور نہ یہ اس پر کوئی الزام رکھتا ہے نہ وہ اس پر" اس قول کا بھی وہی حال ہے کہ سخاوی اور لیث بن سعد کے درمیان سوا سات سو برس سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ دونوں کے درمیان چھ سات راویوں کے نام بتانا چاہئیں جب تک ان نامعلوم راویوں کی وثاقت معلوم نہ ہو، اس وقت تک اس روایت کی توثیق اور اس قول کی تصدیق کس طرح کی جا سکتی ہے؟

آخر میں خود سخاوی صاحب اس کا اعتراف فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے کہا کہ یہ دراصل کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ ایک بات ہے جو زبانوں پر مشہور ہو گئی ہے۔ لیجئے خود سخاوی صاحب نے اپنے شیخ کا فیصلہ اسی حدیث کے متعلق سنا دیا۔ اب بھی اگر کوئی اسکو حدیث رسول ہی کہتا ہے تو پھر اس سے خدا ہی سمجھے۔

(باقی آئندہ)

پندرہ اگست کا جشن آزادی آرہا ہے

ہم نے آٹھ سالہ دورِ حکومت میں جشنِ آزادی کس طرح منائے؟ جشن آزادی کسے کہتے ہیں؟ ہم نے کیا کچھ کیا اور کیا کچھ ہمیں کرنا چاہئے تھا؟ ان سوالات کے لئے ادارۂ طلوع اسلام کی عظیم پیشکش ——— "جشن نامے" ——— ملاحظہ فرمائیے

یہ کتاب بلند پایہ حقائق کا مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع ہے۔ شروع میں قریب پچاس عنوانات ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر بیک وقت آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ طنز و تنقید کے ایسے گہرے نشتر اور اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ کتاب کیا ہے ہمارے چھ سالہ دور حاضرہ کی سمٹی ہوئی تاریخ ہے۔ صفحات ۲۵۶ قیمت مجلد مع گرد پوش دو روپے آٹھ آنے۔

ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

رفتارِ عالم

گذشتہ مہینے جب فرانس کی حکومت ٹوٹی تو جینوا کانفرنس میں ایسی بددلی پھیل گئی کہ اسکی کامیابی کے امکانات کالعدم نظر آنے لگے۔ اِدھر فرانس کے نمائندے "بے حکومت" ہوئے اُدھر برطانیہ اور امریکہ کے نمائندے جینوا چھوڑ کر چلدیئے جس سے عام طور پر یہ فرض کر لیا گیا کہ کانفرنس اپنی موت مر گئی ہے۔ لیکن عین اس حال میں کہ اسکی موت کا یقین سا ہو چلا تھا اس میں نئی جان پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ فرانس میں خلاف توقع بہت جلد نئی حکومت تشکیل ہو گئی اور جو نئے وزیر اعظم ۔ مانڈے فرانس ۔۔۔ برسر اقتدار آئے، انھوں نے بڑے شد و مد سے یہ وعدہ کیا کہ وہ تیس دن کے اندر (یعنی ۲۰ جولائی تک) ہند چینی میں صلح کرا دینگے نیز یہ کہ اگر وہ صلح نہ کرا سکے تو وزارت سے دستکش ہو جائینگے۔ اسوقت تو ان کا وعدہ اضطراری نظر آتا تھا لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے دنیا کو یہ باور کرانا شروع کر دیا کہ وہ اس تنِ مردہ میں جان رفتہ واپس لا سکتے ہیں۔ انھوں نے چین کے وزیر اعظم چواین لائی سے ملاقاتیں کیں اور مفاہمت کیلئے فضا سازگار کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے۔ اس سے دنیا بھر کی نظریں ایک مرتبہ پھر جینوا پر مرکوز ہو گئیں۔ کانفرنس کا یہ عجیب مرحلہ تھا۔ تنہا فرانس اشتراکیوں سے مصروف گفتگو تھا۔ اشتراکی ایک طرف میدان جنگ میں فرانس کو پسپا کئے چلے جا رہے تھے، دوسرے وہ فرانس کے نئے وزیر اعظم کے اس وعدے کا پورا پورا فائدہ اٹھانے پر مصر تھے کہ اگر وہ ۲۰ جولائی تک کامیاب نہ ہوئے تو انھیں وزارت چھوڑنا پڑیگی۔ چنانچہ اشتراکیوں کی کوشش یہ ہو گئی کہ جنگی فتوحات پر زور دیں اور مذاکرات کو کھینچتے جائیں تاکہ ۲۰ جولائی کے لگ بھگ مانڈے فرانس سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر لیں۔ چنانچہ چواین لائی نے اپنے مطالبات یہ پیش کئے:۔

(۱) ویٹ نام میں آزاد انتخابات منعقد کئے جائیں اور ان کے بعد اشتراکی اور غیر اشتراکی عناصر کی مخلوط وزارت مرتب کی جائے۔

(۲) لاؤس اور کمبوڈیا میں موجودہ (غیر اشتراکی) حکومتیں برقرار رہیں لیکن فرانسیسی اور ویٹ منھ فوجیں واپس بلا لی جائیں۔

صورتِ اول میں یہ خدشہ پایا جاتا تھا کہ اشتراکیوں اور غیر اشتراکیوں کی مخلوط حکومت ایک وقت کے بعد اشتراکی ہی ہو جائیگی اور ویٹ نام فرانس کے قبضے سے نکل جائیگا۔ صورت ثانی میں بھی یہی خدشہ تھا یعنی فرانس کی فوج کے انخلاء کے بعد لاؤس اور کمبوڈیا کی دونوں ریاستیں اشتراکیوں کے قبضے میں چلی جائینگی۔

مذاکرات جینوا ان مذاکرات میں فرانس کی پوزیشن واقعی مخدوش تھی اور عین ممکن تھا کہ فرانس ایسی شرائط تسلیم کرلے جس سے ہند چینی اشتراکیوں ہی کے قبضے میں چلا جائے۔ لیکن واقعات کی رفتار نے فرانس کو تنہا نہیں رہنے دیا جیسے کہ سابقہ تبصروں میں ذکر آچکا ہے۔ جینوا کانفرنس نے اس دلخراش حقیقت کو پوری طرح نمایاں کر دیا کہ مغربی اتحادیوں میں اختلافات کی وسیع خلیج حائل ہے۔ نیز یہ کہ اشتراکیوں نے ان اختلافات کو ابھار کر مطلب براری کی پوری کوشش کی ہے۔ برطانیہ کے وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل نے ان اختلافات کو نپٹانے کی بازی لگائی۔ وہ اپنے وزیر خارجہ مسٹر ایڈن کے ساتھ امریکہ گئے اور امریکی صدر سے بالمشافہ گفتگوئیں کیں۔ ان ملاقاتوں کو بین الاقوامی سیاست میں بہت اہمیت دی گئی اور گو وقتی طور پر ان کا نتیجہ چنداں خوش آئند نظر نہیں آتا تھا، بتدریج یہ صاف نظر آنے لگا کہ امریکہ نے برطانیہ سے بہت حد تک اپنی حکمت عملی پر صاد کرا لیا ہے۔ ہند چینی میں امریکہ برطانیہ اور فرانس کے اختلافات کی صورت یہ تھی۔ فرانس ہند چینی کی جنگ سے اس حد تک عاجز آچکا تھا کہ اس کے نزدیک جنگ کا خاتمہ زیادہ وقیع تھا۔ امریکہ اس قسم کی صلح چاہتا تھا جو بالآخر ہند چینی کو اشتراکی ملک نہ بنا دے۔ اس کے علاوہ اس کی حتمی رائے یہ ہے کہ اشتراکی امن کے متمنی نہیں۔ وہ مذاکرات کو مطلب براری کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کا علاج یہ نہیں

کہ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جائیں بلکہ یہ کہ ان کے مقابلے کیلئے دفاعی تنظیمیں تشکیل کی جائیں۔ اس لئے اس نے ایشیا میں ناٹو NATO کے نمونے کا "سیٹو" (SEATO) کا منصوبہ پیش کیا۔ برطانیہ عجیب تذبذب میں تھا۔ وہ چین کو ناخوش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس چین سے تجارتی تعلقات قائم کرنے کی غرض سے اس کیلئے بھی تیار تھا کہ امریکہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ چین کو اقوام متحدہ کا رکن بننے دے۔ مزید برآں اس کی نظریں ہندوستان پر بھی تھیں۔ وہ ہندوستان سے مل کر ہندوستان میں اپنے اجاروں کا بھی تحفظ کرنا چاہتا تھا اور اس کی مدد سے ایشیا میں بھی مناسب مقام حاصل کئے رکھنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "سیٹو" کی تجویز کا مؤید نہیں تھا۔ برطانیہ نے اس کی بجائے یہ تجویز پیش کی کہ جنوب مشرقی ایشیا میں لوکارنو معاہدہ کی طرح کا ایک معاہدہ کر لیا جائے۔ لوکارنو معاہدہ ۱۹۲۵ء میں برطانیہ، جرمنی، بلجیم، فرانس اور اٹلی میں طے ہوا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ معاہد قومیں بیرونی حملے کی صورت میں ایک دوسرے کی امداد کریں گی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں اس تجویز کا مطلب یہ تھا کہ متعلقہ اقوام بشمول اشتراکی چین بیرونی حملہ کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کو پہنچنے کا عہد کرتیں۔ یہ معاہدہ بداہتاً ناقابل عمل ہوتا کیونکہ اپنے خصوصی مزاج کی بدولت اشتراکی اور مغربی اقوام معاہد نہیں ہو سکتیں۔ نیز یہ معاہدہ اشتراکیت کے فروغ کے خلاف کوئی ضمانت نہ ہوتا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آئزن ہاور اور چرچل کی ملاقات سے یہ اختلافات ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن ایسے پتہ چلتا ہے کہ اقوام مغرب کی حکمت عملی میں ہم آہنگی کے آثار ضرور پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کا اندازہ ایک تو اس سے ہوتا ہے کہ برطانیہ نے لوکارنو معاہدہ پر اصرار چھوڑ دیا ہے اور اب "سیٹو" کی تشکیل سے متعلق مذاکرات ہو رہے ہیں۔ دوسرے جنیوا کانفرنس جو کہ سمٹ سمٹا کر فرانس اور چین کے درمیان ملاقاتوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اس میں پھر سے برطانیہ اور امریکہ شریک ہو گئے ہیں۔ محض یہی نہیں بلکہ امریکہ اور برطانیہ نے باہمی طور پر سات شرائط طے کی ہیں جن کے مطابق فرانس کو ہندچینی میں صلح کرنی چاہئے۔ ان شرائط کا اعلان نہیں ہوا لیکن فرانس نے انہیں منظور کر لیا ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندچینی کے مذاکرات امریکہ کی منشا کے مطابق آگے بڑھیں گے۔ ظاہر ہے کہ امریکہ کوئی ایسی صورت حال پیدا نہیں ہونے دیگا جس سے ہندچینی بآسانی اشتراکی قبضہ میں چلا جائے۔ لیکن آثار و قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندچینی اشتراکی اور غیر اشتراکی حصوں میں بٹ جائے گا اور یہ تقسیم دائمی سی ہو جائے گی۔

فیصلہ کن تاریخ!

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ۲۰ جولائی سے پیشتر معاہدہ ہو سکے گا؟ ہرچند اب تک اشتراکی چین نے فرانس کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھانا چاہا ہے کہ اس کا نامزدہ ۲۰ جولائی تک جنگ بند کرانے میں کامیاب نہ ہوا تو وہ مستعفی ہو جائیگا لیکن اب ایسے نظر آتا ہے کہ چین بھی مفاہمت میں مصلحت دیکھتا ہے۔ چین کی زیادہ تر جدوجہد یہ رہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طریق سے اقوام متحدہ کا رکن بن جائے۔ ابتک اقوام متحدہ اور اس کے متعدد اداروں میں کوئی ایک سو پچاس مرتبہ چین کیلئے یہ کوشش ہو چکی ہے کہ وہ اس کا رکن بن جائے مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ اب اسکی نظریں آئندہ والی جنرل اسمبلی پر ہیں۔ وہ رکنیت حاصل کرنے کیلئے سر توڑ کوشش کرنا چاہتا ہے۔ اس کیلئے اسے دیگر ارکان کی تائید کی ضرورت ہے۔ وہ ہندچینی میں پوری ذمہ داری سے کام لیکر اقوام متحدہ کے ارکان کی اکثریت کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہندچینی میں لڑائی بند ہو جائے تو خود فرانس اور برطانیہ اس کے مؤید ہو جائیں گے اور اس طرح امریکہ کی مخالفت کمزور ہو جائیگی۔ یہ چین کی کمزوری ہے جس کے پیش نظر توقع کی جا رہی ہے کہ وہ آمادہ بہ مفاہمت ہو جائیگا۔ اندریں حالات ہندچینی کے جنگ بند ہو جانے کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چین اس قیمت پر رکنیت خرید سکے گا۔ امریکہ کا رویہ چین کے معاملے میں متشدد ہے۔ ان دنوں جبکہ رکنیت کا چرچا ہونا شروع ہوا ہے تو امریکہ میں مخالفت کا طوفان امنڈ آیا ہے۔ بعض اعلیٰ حربی قائدین نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اقوام متحدہ کو امریکہ اور چین میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر

چین رکن بن گیا تو امریکہ اقوام متحدہ کو چھوڑ دیگا۔ گو امریکہ کا اقوام متحدہ سے نکلنا قرین قیاس نہیں تاہم یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جب بھی چین کی رکنیت کا سوال سامنے آیا وہ حق استرداد (ویٹو) ضرور استعمال کریگا۔

اقوام مغرب کے اختلافات باہمی کا اثر یورپ کی سیاست پر بھی پڑ رہا ہے۔ یورپ کے دفاعی سلسلہ سے متعلق جو معاہدہ دو سال پیشتر ہوا تھا اس کی دیگر اقوام نے تو تصدیق کر دی ہے لیکن فرانس اسے برستور ٹالتا چلا آ رہا ہے وہ جرمنی کے ڈر سے ایسا کر رہا ہے اور نہیں چاہتا کہ جرمنی مسلح ہو جائے۔ اب فرانس کے نئے وزیر اعظم نے پھر اس معاہدہ کا ذکر چھیڑا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس سے پھر برطانیہ اور امریکہ میں اضطراب پیدا ہو گیا چنانچہ دونوں ممالک فرانس کو دھمکی دے رہے ہیں کہ اگر اس نے جلد معاہدہ مذکور کی تصدیق نہ کردی تو جرمنی کو آزاد کر کے E. D. C. میں شریک کر لیا جائے گا۔ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ امریکہ اور برطانیہ واقعی ایسا کریں گے لیکن جرمنی کو مسلح کرنے کیلئے معاہدوں کی رو سے انھیں فرانس کی رضامندی ضرور حاصل کرنا پڑیگی۔ ان دنوں اس سلسلہ میں تگ و دو ہو رہی ہے۔

"چین و ہند بھائی بھائی"

جون کے آخر میں جبکہ واشنگٹن میں صدر آئزن ہاور اور چرچل کی ملاقاتیں ہو رہی تھیں، نئی دہلی میں پنڈت نہرو نے چین کے وزیر اعظم چو این لائی کو اپنے ہاں مدعو کر رکھا تھا۔ ان دو کانفرنسوں میں ایک ہی تاریخوں پر منعقد ہونا ایسا "اتفاق" تھا جس کا ہندوستان کے منادوں نے خوب ڈھنڈورہ پیٹا اور نئی دہلی کی ملاقاتوں کو واشنگٹن کی ملاقاتوں کا درجہ دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ انھوں نے یہ بھی دنیا بھر کو جتایا کہ دونوں ملاقاتیں ایشیا کی قسمت سے متعلق ہو رہی ہیں لیکن نئی دہلی کے مذاکرات کا اثر دوررس ہوگا۔ ہندوستان نے چینی وزیر اعظم کے استقبال میں بڑے مبالغے سے کام لیا اور "چین و ہند بھائی بھائی" کے نعرے لگا لگا کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے دوست ہیں اور وہی ایشیا کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ چو کو بلا کر در اصل پنڈت نہرو امریکہ پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ بین الاقوامی منڈی میں ان کا بھاؤ کیا ہے لیکن اس طرح انھوں نے اپنی قیمت کو اور گرایا ہے۔ ہندوستان چین کا حریف نہیں ہو سکتا مگر وہ اس خطرے کو ٹال بھی نہیں سکتا۔ اسکی البتہ ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ چین کی خوشامد کی جائے۔ ہندوستان یہی چال چل رہا ہے وہ اس سے دوسرا فائدہ یہ اٹھانا چاہتا ہے کہ امریکہ اسے چین کی طرف جھکتا دیکھ کر اس کی خوشامد کرے اور اسے زیادہ سے زیادہ مالی مدد دے۔

چو این لائی نے ہندوستان کی اس روش کو اپنے مفید مطلب بنانے کی بازی لگائی۔ اس سے پیشتر چین اور دیگر ایشیائی اقوام کے مابین معاہدہ عدم تعرض کا اشاروں کنایوں سے ذکر آ چکا ہے۔ ہندوستان کی ایسے معاہدے سے غرض کچھ بھی ہو، یہ ظاہر ہے کہ چین سے جو معاہدہ ہوگا اس میں برتری چین ہی کو حاصل ہوگی۔ گویا نئی دہلی کی ملاقات چین کی طرف سے قیادت ایشیا حاصل کرنے کی ایک اہم کوشش تھی۔ نہرو اور چو کی سہ روزہ ملاقاتوں سے جو بات ابھر کر سامنے آئی وہ یہی تھی کہ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے، ان کی سرحدات کو توڑا نہ جائے وغیرہ۔ اس ضمن میں تبت کے معاہدہ کا بھی ذکر آیا جو چین اور ہندوستان کے مابین طے پا چکا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس معاہدہ کی رو سے ہندوستان نے نہ محض تبت کو چین کا حصہ تسلیم کر لیا بلکہ وہ وہاں سے پسپا بھی ہو آیا۔ اس موقع پر تبت کے معاہدے کے ذکر کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ چین ہندوستان سے ایک اور پسپائی کا مطالبہ کر رہا ہے۔

خلافِ پاکستان مساعی

ہندوستان عالمی سیاست میں اسقدر الجھا ہوا ہے مگر وہ پاکستان کی تخریب کے اساسی فریضہ سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں۔ ان دنوں اس کی زیادہ تر توجہ پاکستان کو دریائی پانی سے محروم کرنے پر مرکوز رہی ہے ہندوستان نے پچھلے سال ۱۹۵۳ء میں دریاؤں کا پانی روکا تھا اور اس کے بعد پانی کی ہم رسانی سے متعلق پاکستان کو تشویش سی رہتی

تاہم پانی جاری رہا۔ یہ تنازع جاری تھا کہ ۱۹۵۲ء میں عالمی بنک کی معرفت پاکستان اور ہندوستان میں پانی کی تقسیم کے لئے مذاکرات شروع ہوئے مذاکرات کی طرح پڑی تو ہندوستان نے (کہ وہ دریاؤں کے سرچشموں پر قابض تھا) عالمی بنک سے یہ عہد کیا کہ وہ اس تنازع کا تصفیہ ہونے سے پہلے دریاؤں کے بہاؤ میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کریگا۔ یہ مذاکرات دو سال سے جاری ہیں لیکن تاہنوز کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ ہندوستان ایک طرف ان مذاکرات میں مصروف رہا اور دوسری طرف بھاکرہ نگل منصوبہ کی تکمیل میں کوشاں رہا جو دریائے ستلج کا پانی نہروں کے ایک نئے جال میں منتقل کرکے ہندوستان کے صحراؤں کو سرسبز و شاداب بنا دیگا لیکن پاکستان کے سبزہ زاروں کو پھر سے صحراؤں میں تبدیل کر دیگا۔ ہندوستان چونکہ تصفیہ سے پیشتر ستلج کا پانی اپنا نہیں سکتا تھا اسلئے اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان نے عالمی بنک کی تجاویز کو مسترد کر دیا ہے جس سے مذاکرات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے لہٰذا ہندوستان آزاد ہے کہ وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کرے۔ بعض ہندوستانی مندوبوں نے ان تجاویز کو ثالثی فیصلہ تک کہہ دیا حالانکہ امر واقعہ صرف اس قدر تھا کہ عالمی بنک نے تجویز پیش کی تھی کہ ستلج، بیاس اور راوی کے دریاؤں کا پانی ہندوستان استعمال کرے اور چناب، جہلم اور سندھ کا پانی پاکستان استعمال کرے۔ یہ تجویز پاکستان نے رد نہیں کی بلکہ ابھی حکومت کے زیر غور ہے۔ بعض اطلاعوں سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ ہم اول الذکر تین دریاؤں سے اس وقت تک محروم نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم آخر الذکر تین دریاؤں میں سے بہت سی نئی نہریں نہ کھود لیں جن سے اس کی تلافی ہو سکے۔ اس پر عالمی بنک نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان اس مطلب کیلئے پاکستان کو چھ کروڑ روپیہ ادا کرے۔ ہندوستان اس شرط پر آمادہ تو ہو گیا لیکن پھر سوال پیدا ہوا کہ کیا ہندوستان واقعی یہ رقم پاکستان کو بلا حیل و حجت دیدیگا۔ اس سے پیشتر اس نے کئی رقوم بہ لطائف الحیل ادا نہیں کیں۔ اس پر پاکستان نے مطالبہ کیا کہ اس رقم کی ادائیگی کی ضمانت عالمی بنک دے لیکن بنک نے ایسا کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اب یہ معاملہ یہاں رکا ہوا ہے۔

ہندوستان نے اس مرحلہ پر عجیب روش اختیار کی۔ اس نے اول تو بنک کی مذکورہ بالا تجویز کو ثالثی فیصلہ کہنا شروع کر دیا جو بالکل غلط تھا پھر یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان نے تجویز کو مسترد کر دیا ہے (حالانکہ یہ بھی خلاف واقع ہے) جس سے مذاکرات ختم ہو گئے ہیں اور ہندوستان اس پابندی سے آزاد ہو گیا ہے کہ وہ دریاؤں کے پانی میں مداخلت نہ کرے۔ یہ کہہ کے ہندوستان نے ۸ جولائی کو بھاکرہ نہر کا افتتاح کر دیا اور ستلج کا معتدبہ پانی اس کی طرف منتقل کر دیا۔ اس نہر کا منصوبہ تقسیم سے پیشتر کا ہے۔ اصل اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ اس سے پاکستان اور ہندوستان کے دونوں علاقوں کو سیراب کیا جائے لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ جہاں ہندوستان کے خشک علاقے سیراب ہونگے وہاں پاکستان کے زرخیز علاقے خشک ہو جائیں گے ہر چند اس نہر کا پاکستان کو علم تھا اور یہ بھی حکومت کو معلوم تھا کہ اس کا پاکستانی معیشت پر کیا اثر پڑیگا۔ عالمی بنک سے مذاکرات میں بھی اسے پیش نظر رکھا گیا تھا۔ یوں بھی پاکستان کو ۱۹۴۸ء میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ ہندوستان نے عین وقت پر پانی روک دیا تھا اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً پانی کے بہاؤ میں مداخلت کرتا چلا آ رہا تھا، لیکن اس کے باوجود نہ تو مذاکرات کے ذریعہ اس کا حل تلاش کیا گیا اور نہ متبادل ذرائع آبپاشی کا ہی انتظام کیا گیا۔ چنانچہ جب نہر کا افتتاح ہوا اور خطرہ حقیقی ہو گیا اور جگہ جگہ سے یہ اطلاعیں آنے لگیں کہ ستلج کا پانی کم ہو گیا ہے تو کابینہ پاکستان کا ہنگامی اجلاس منعقد ہوا اور ہندوستان کو شدید احتجاج بھیجا گیا، ملک بھر میں زید، عمر، بکر نے بیانات سے اخبارات کے کالم کے کالم سیاہ کر دیئے لیکن ستلج کا جو پانی ہندوستان نے ہتیا لیا ہے اس کا کچھ بھی بدل نہ مل سکا۔ ہندوستان نے جو صورت حال پیدا کر دی اس کے دو جواب ہو سکتے تھے۔ اول یہ کہ فوجی قوت کے زور پر ہندوستان کے اس جارحانہ اقدام کو روکا جائے اور دوسرے یہ (اور یہ اس کے باوجود ہونا چاہیئے) کہ ایسی نئی نہریں کھودی جائیں جو ان علاقوں کو سیراب کریں جنہیں ہندوستان نے پانی سے محروم کر دیا ہے۔

جہانتک فوجی کارروائی کا تعلق ہے اس کیلئے ہر چند بہت سے امور کو سوچنا پڑتا ہے لیکن قوموں کی زندگی میں بعض فیصلے ایسے ناگزیر ہو جاتے ہیں کہ نتائج وعواقب کو معمولی پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ ہندوستان کا منصوبہ اگر کامیاب ہو جائے تو پاکستان صحرائے اعظم بن جائیگا۔ اس میں انسانوں کیلئے غذا پیدا ہوگی نہ مویشیوں کیلئے چارہ۔ اس سے بڑھکر اور کونسا سنگین موقع آسکتا ہے۔ اس وقت پبلک اور اخبارات میں فوجی کارروائی کا ضرور ذکر آرہا ہے لیکن حکومت نے مصالحت پسندی کا ہی ثبوت دیا۔ وزیر اعظم نے ہندوستان کو یہ پیشکش کی کہ ہر چند معاہدہ کی رو سے اسے ستلج کا پانی غصب کرنے کا حق نہیں ہے تاہم وہ اس کیلئے بھی تیار ہیں کہ ایسا فیصلہ کر لیا جائے جس سے بھاکرہ نہر کو بھی پانی میسر آسکے لیکن ہندوستان مصالحت کیلئے تیار نہیں وہ پاکستانی دریاؤں کے سرچشموں پر قابض ہے اور پاکستان کیلئے نت نئی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ کیوں صلح کی بات کرے۔ چنانچہ نئی دہلی کی اطلاعات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان پاکستانی احتجاج کو رد کر دیگا اور مزید گفتگو کیلئے تیار نہیں ہوگا۔

قول و فعل

جہانتک نئی نہروں کا تعلق ہے اس سلسلہ میں گو پنجاب میں کچھ کام ضرور ہوا ہے لیکن اب بھی ایسی سنعدی کا مظاہرہ نہیں کیا جا رہا جس سے معلوم ہو کہ مصیبت سر پر آجانے سے ہی قائدین ملک کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ ایک تازہ پریس کانفرنس میں وزیر اعظم نے اس تنازع پر تفصیلی گفتگو کی لیکن اس کا انداز وکیلانہ بحث کا تھا۔ پاکستان کا مقدمہ اپنی جگہ بجا لیکن ہندوستان سے معاملہ دلائل سے طے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہاں دلائل ہی دلائل ہیں اور عمل کا نام نہیں۔ اس کانفرنس میں وزیر اعظم صاحب نے کہنے کو تو یہاں تک کہدیا کہ وہ نئی نہریں کھودینگے اور ضرورت پڑی تو خود جا کر کھودیں گے لیکن ان کے بیان سے کہیں پتہ نہیں چلتا کہ کچھ منصوبہ بندی کر لی گئی ہے اور اس کی تکمیل کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ اس بیان سے عمومی افسردگی پھیل گئی ہے۔ دلائل کے اعتبار سے بھی یہ بیان موثر ثابت نہیں ہوا۔ ایک موقع پر وزیر اعظم نے یہ شکایت کی کہ عالمی بنک نے نامکمل معلومات کی بنا پر فیصلہ دیا ہے لیکن جب بعض اخبار نویسوں نے پاکستانی نمائندوں پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے پاکستانی مقدمہ ٹھیک طرح پیش نہیں کیا اور ضروری اعداد و شمار مہیا نہیں کئے تو وزیر اعظم نے اس الزام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن یہ بھی نہ بتا سکے کہ عالمی بنک نے کیوں نامکمل اعداد و شمار پر انحصار کیا۔ دوسرے مقام پر آپ سے یہ سوال کیا گیا کہ جب آپ کو معلوم تھا کہ بھاکرہ نہر کھودی جا رہی ہے اور بالآخر اس میں پاکستانی حصے کا پانی استعمال ہوگا تو آپ نے کیوں بروقت حفاظتی تدابیر اختیار نہ کیں! اس کے جواب میں وزیر اعظم نے فرمایا کہ وہ ہندوستان کی دیانت پر اعتماد کئے رہے اور یہ سمجھتے رہے کہ ہندوستان معاہدوں کا پاس کریگا حالانکہ بچہ بچہ جانتا ہے کہ گذشتہ سات سال میں ہندوستان نے شاید ہی پاکستان سے کوئی ایسا معاہدہ کیا ہو جسے اس نے دیانتداری سے پورا کیا ہو۔ یہ ایک ناقابل تردید اور معلوم حقیقت ہے اس کے باوصف ہندوستان کی دیانت کا ذکر اپنی بے عملی کو چھپانا نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے۔

دریائی پانی سے کشمیر کا سوال ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ پانی کا مسئلہ دراصل کشمیر ہی کا پیدا کردہ ہے۔ اگر کشمیر پاکستان میں شامل ہو جائے تو پاکستانی دریاؤں کے سرچشمے پاکستان ہی کے قبضے میں آجائیں گے۔ اسوقت یہ کہنا مشکل ہے کہ حکومت کشمیر کے بارے میں کیا کر رہی ہے۔ گذشتہ سال وزیر اعظم نے پنڈت نہرو سے براہ راست مذاکرات شروع کئے تھے اور انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ اپریل ۱۹۵۴ء تک ناظم استصواب کا تقرر ہو جائے گا۔ لیکن نہ صرف ایسا نہیں ہوا بلکہ پنڈت نہرو نے اس دوران میں شیخ عبداللہ کو معزول کر کے گرفتار کیا (محض ایک عبداللہ کا معاملہ ایسا تھا کہ اسی پر ہندوستان کا مقدمہ ختم کرایا جا سکتا تھا) بلکہ یہ کوشش کی کہ ناظم استصواب کے تقرر تک معاملہ پہنچنے نہ پائے۔ اندریں حالات اگر اپریل سے پہلے نہیں تو اپریل کے فوراً بعد یہ سوال سامنے آجانا چاہیئے تھا کہ اب جبکہ ہندوستان سے براہ راست مذاکرات ناکام بنا دیئے گئے ہیں تو کشمیر میں کیا کیا جائے۔ اس دوران میں کئی مرتبہ یہ کہا گیا کہ اب معاملہ پھر سے اقوام متحدہ میں پیش کیا جائیگا اور دراصل یہی ایک صورت بھی تھی۔ لیکن معلوم نہیں کہ حکومت کے مصالح کیوں اس کی اجازت نہیں دیتے کہ کشمیر کے متعلق مزید اقدام کریں۔ اپریل کے بعد بھی تین ماہ گذر چکے ہیں اور ابھی تک فیصلہ نہیں ہو پایا۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو وقت ہی ناتوامی سیاست

میں ہماری پوزیشن پہلے سے بہتر ہے۔ ہمارا امریکہ سے بھی فوجی معاہدہ ہو چکا ہے اور ترکی سے بھی۔ ہم امریکہ سے بھی اپنی تائید کی توقع رکھ سکتے ہیں اور ترکی سے بھی۔ اس صورت حال کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بعض حلقوں میں یہ خدشہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ شاید یہی دوستی کشمیر کے راستے میں حائل ہے۔ ایسا ہے یا نہیں، حکومت پاکستان کے مذبذب سے کئی طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

گلِ دیگر!

ہندوستان کے معاملے میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ابھی دنوں ہمارے وزیر اقلیت مسٹر غیاث الدین پٹھان دہلی تشریف لے گئے تاکہ ہندوستانی وزیر اقلیت سے ملاقات کریں اور اقلیتوں سے متعلق گفتگو کریں۔ یہ واضح رہے کہ ہندوستان میں نہ محض ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے ہیں بلکہ علانیہ طور پر مسلمانوں کو شدھ کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان پر روزگار کی کئی صورتیں بند ہیں اور انہیں طرح طرح سے جائدادوں سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کھوکھرا پار سے ہر روز مہاجرین پاکستان میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی بند نہیں ہوا۔ اس کے باوجود ہمارے وزیر اقلیت ملاقاتوں کے بعد جس مشترکہ اعلامیہ پر دستخط کرتے ہیں اس میں ان امور کا تو ذکر نہیں ملتا اور صرف مشرقی بنگال کے متعلق اس میں تحریر ہوتا ہے کہ وہاں سے ہندو بھاگ رہے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ ہندوستان سابق وزیر اعلیٰ فضل الحق کی حمایت کرتا رہا ہے حتیٰ کہ ان کی برطرفی کے بعد بھی یہ حمایت جاری ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ وہ فضل الحق حکومت کے ذریعہ اپنی مطلب براری کرا سکتا تھا۔ ان کی معزولی پر ہندوستان نے یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ ہندوؤں میں بھگدڑ مچ گئی ہے اور وہ اپنے آپ کو گورنری راج میں غیر محفوظ پا کر ہندوستان چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ نئی دہلی کے مشترکہ اعلامیہ میں یہ کہا گیا کہ جب دونوں وزرا کی توجہ اس کی طرف منعطف کرائی گئی تو پٹھان صاحب نے کہا کہ وہ اعداد و شمار دیکھ کر صورت حال کا تعین کریں گے۔ اول تو یہی بات از حد قابل اعتراض ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا ہے اور جس کا خمیازہ پاکستان بھگت رہا ہے اس کا کچھ پتہ چل جانا ہو۔ دوسرے ذکر ہو تو محض مشرقی بنگال کا جس میں کچھ صداقت نہیں۔ اس سے عام طور پر یہی رائے قائم کی جائیگی کہ پاکستان اور ہندوستان میں اگر کچھ ہو رہا ہے تو یہ کہ مشرقی بنگال سے ہندو ترک وطن کر کے ہندوستان بھاگ رہے ہیں اور یہ اتنے عظیم پیمانے پر ہو رہا ہے کہ اقلیتی وزراء جو عمومی باتوں کا جائزہ لیتے ہیں، وہ بھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس ایک واقعہ کا خصوصی ذکر کریں۔ تعجب ہے کہ ہمارے وزیر اقلیت کے پاس اتنے اعداد و شمار بھی موجود نہیں تھے کہ وہ اسی وقت اس بے بنیاد خبر کی تردید کر دیتے۔ نیز ہندوستانی وزیر اقلیت کو یہ بتاتے کہ مسلمانان ہندوستان پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔ جب بین الاقوامی مذاکرات میں اس طرح کے نمائندے شریک ہوں اور ان کی معلومات کا یہ عالم ہو تو اس پر مطلقاً تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ فیصلے ہمارے حق میں نہیں ہوتے۔

سیاسی زندگی

یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ پاکستان میں سیاسی زندگی ختم ہو چکی ہے۔ عہد حاضر میں سیاسی زندگی کا ثبوت فعال اور متحرک سیاسی پارٹیوں میں تلاش کیا جاتا ہے لیکن پاکستان میں صورت یہ ہو چکی ہے کہ مسلم لیگ مردہ جماعت ہو چکی ہے۔ اب تو اس کی مردنی کا یہ عالم ہے کہ اسکے احیار کی تمام کوششیں بھی بے سود ثابت ہو رہی ہیں۔ مسلم لیگ کی بجائے ابھی تک کوئی نئی سیاسی جماعت تشکیل نہیں ہو سکی۔ لے دے کے بنگال کا جگتو فرنٹ معرضِ وجود میں آیا تھا لیکن وہ بھی صحیح معنوں میں سیاسی پارٹی نہ تھا کیونکہ وہ کئی پارٹیوں کا مرکب تھا اور پھر اس کا دائرہ عمل اسمبلی کے اندر محدود تھا۔ مزید برآں اس کے عزائم و مقاصد سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سرے سے پاکستانی تصور ہی کا موید نہ تھا۔ موجودہ نظریات کے مطابق قوم اور حکومت کے مابین رابطہ سیاسی پارٹی سے قائم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ رابطہ موجود ہی نہیں۔ ایسی صورت میں حکومت کو براہ راست عوام سے رابطہ قائم کرنا چاہئے لیکن حکومتی نمائندے ایک تو ایسے رابطہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ اس کی اہلیت کا ہی انھوں نے ثبوت دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم [illegible]

حال میں پریشان ہے اور حکومت دفاتر میں اپنا کاروبار چلا رہی ہے۔ قیادت و ملت کے درمیان خلیج اس وسعت کی حائل ہو جائے تو پھر اللہ ہی مالک ہے۔ ہمارے ہاں جو کچھ ہو رہا ہے ـــ یا جو کچھ نہیں ہو رہا ہے ـــ اس کی وجہ صرف یہی ہے۔ پاکستان اب عملاً ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں سیاسی پارٹیوں کے وجود کو یکسر ختم کر دینے کی ضرورت ہے۔ سیاسی پارٹیاں سرے سے موجود ہی نہیں، اسلئے کسی قسم کی تخریب کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی تمام مساعی کو اس پر مرکوز کرنا ہوگا کہ کس طرح حکومت کے کارندے عوام کے نمائندے بن جائیں اور ان دونوں کے مابین کوئی فاصلہ نہ رہے۔ اگر ملی مساعی کی سمت یہ ہو جائے تو موجودہ بے عملی، بے یقینی اور افسردگی کا دور ختم ہو سکتا ہے۔

لیکن ایسے آثار بالکل نظر نہیں آ رہے۔ ارباب سیاست کے فکر و نظر کی سطح کا قیاس اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے ایک بنگالی رکن نے ان دنوں پارٹی میں یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ ۲۱ سال تک کیلئے مسلم لیگ کے علاوہ دیگر سیاسی پارٹیوں کو ممنوع قرار دیدیا جائے ایک پارٹی کا تجربہ کمال اتاترک نے ترکی میں کیا تھا۔ جو کامیاب رہا۔ روس میں بھی ایک ہی پارٹی کام کر رہی ہے لیکن یہ دونوں مثالیں پاکستان پر صادق نہیں آتیں۔ ترکی میں ـــ اور روس میں بھی ـــ جو انقلابات آئے وہ انہی پارٹیوں کے پیدا کردہ تھے جو بعد میں فائز حکومت ہوئیں۔ پاکستان کا معاملہ اس اعتبار سے ترکی اور روس سے ملتا ہے کہ یہاں بھی مسلم لیگ ایک ایسی جماعت موجود ہے جس نے پاکستان قائم کیا لیکن اگر مسلم لیگ تقسیم کے فوراً بعد قوم سے یہ مطالبہ کرتی کہ مسلم لیگ نے پاکستان بنایا ہے اور اب ایک مدت تک اسے ہی یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ اس کی صحیح خطوط پر تربیت و استحکام کرے تو ملک و ملت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اسوقت مسلم لیگ کا وقار دلوں میں تھا اور عوام کو اس پر اعتماد تھا۔ نیز قائد اعظم کی ذات گرامی موجود تھی۔ لیکن سات سال کے دوران میں مسلم لیگ نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ پاکستان کو مضبوط و منظم بنانے کی اہل نہیں۔ اس وقت جو خبیث پھل پاکستانیوں کے حصے میں آئے ہیں وہ اسی کی سیاست کا نتیجہ ہیں۔ بنگال میں جگتو فرنٹ کا عروج بھی مسلم لیگ کی سیاست ہی کا ثمر ہے۔ ان حالات میں تجویز مذکور کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا کہ "بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم" بہ نظر غائر دیکھا جائے تو مسلم لیگ کے سامنے میدان اب بھی خالی ہے۔ وہ کوئی کام کر کے دکھائے تو ملک میں محترم بن سکتی ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری جماعت اب تک ہر دلعزیز نہیں ہو سکی۔

کیف تحی الموتیٰ! لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مسلم لیگ کا یہ حال ہو چکا ہے کہ اب اس کا احیا بھی آسان نظر نہیں آتا۔ ایک عرصے سے یہ تجویز ہو رہی ہے کہ ایک کنونشن طلب کیا جائے جس میں مسلم لیگ کے نئے اور پرانے کارکن شریک ہوں اور اس طرح جماعتی احیاء کا کوئی لائحہ عمل مرتب کیا جائے پہلے اس کنونشن کیلئے اپریل کا مہینہ تجویز ہوا تھا، پھر جولائی کے آخر میں تین تاریخیں مقرر ہو گئیں۔ اب اسے اکتوبر تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مشرقی بنگال سے جہاز بروقت نہیں چلے گا اور پھر عید ہے، محرم ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس قیادت کے کیا کہنے جو اصولی ملی مسائل کو ان معمولی اور بے کار وجوہات کی بنا پر ملتوی کرتی چلی جا رہی ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب مسلم لیگ کے احیاء کا مسئلہ سامنے آیا تو فوراً یہ سوال سامنے آ گیا کہ جماعت کا صدر کون ہوگا۔ یہ سوال اسلئے پیدا نہیں ہوا کہ صدارت کے لئے موزوں ترین فرد کو منتخب کیا جائے بلکہ اس سے یہ تگ و دو شروع ہو گئی کہ صدر کون بنتا ہے۔ گو کئی دعویدار پیدا ہوئے لیکن رفتہ رفتہ سب چھٹتے گئے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں کسی ایسے شخص پر نظریں نہیں جم سکیں جو مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کے تقاضوں کو پورا کر سکتا۔ ان دنوں عمومی اعتبار سے محترمہ فاطمہ جناح پر اتفاق پایا جاتا ہے گو بعض حلقوں میں قابل فہم وجوہ کی بنا پر یہ کوشش ہو رہی ہے کہ وہ صدر نہ بنیں۔

ان دنوں سردار عبدالرب نشتر نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے استعفا دیدیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ مسلم لیگ کا احیا فوری چاہتے ہیں لیکن ارباب لیگ اسے ملتوی کرتے چلے آتے ہیں۔ نشتر صاحب کا رویہ اپنی جگہ دلچسپ ہے۔ آپ برسوں سے مسلم لیگ سے متعلق ہیں اور اس اعتبار سے مسلم لیگ کی تباہی کے ویسے ہی ذمہ دار ہیں جیسے وہ دوسروں کو گردانتے ہیں۔ لیکن حکومت سے علیحدہ ہو کر انھوں نے یہ مہم شروع کر دی کہ مسلم لیگ کے کرتا دھرتا وہی بن جائیں۔ کہیں نئے اور پرانے مسلم لیگیوں کو یکجا کرنے کے دعوے باندھے گئے اور کبھی مسلم لیگ ہمیں واپس کردو کے مطالبے کئے گئے۔ لیکن معاملہ جہاں تھا وہیں رہا۔ کیونکہ عمل صفر تھا۔ جب اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا تو آپ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ میں شریک ہو گئے اور اس کا جواز یہ دیا کہ صدر مسلم لیگ نے ان سے کچھ عہد و پیمان کئے ہیں۔ کیا عہد و پیمان ہوئے؟ اس کا پبلک کو علم نہیں تھا۔ یہ عہد و پیمان پورے ہوئے یا نہیں اور نہیں ہوئے تو کیوں؟ یہ بھی کوئی نہیں جانتا۔ اب اچانک وہ مستعفی ہو گئے ہیں، مسلم لیگ سے نہیں، مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے۔ حالانکہ اگر انھیں یہ یقین ہے کہ ارباب لیگ جماعتی تنظیم کو ٹال رہے ہیں تو انھیں ایسی جماعت سے ہی علیحدہ ہو جانا چاہیے تھا۔ استعفیٰ کے وقت یہ بتایا گیا تھا کہ آپ وضاحتی بیان دینگے۔ یہ بیان ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آیا۔ اس ایک واقعہ سے مسلم لیگ کی حیات و ممات اور اس کے متعلقین کے کردار کا قیاس کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جو گروہ اپنی جماعت کی از سرِ نو تنظیم نہیں کر سکتا وہ اس انقلابی تصور کو کیسے قبول کر سکتا ہے کہ ملت میں پارٹیوں کی ضرورت نہیں۔ ملت بجائے فرد ایک پارٹی ہے۔

مسلم لیگ کے احیاء کے سلسلہ میں ایک قابلِ قدر کوشش پنجاب کے وزیر اعلیٰ، ملک فیروز خاں نون نے کی ہے۔ انھوں نے برطانوی احزاب سیاسی کے آئین و نظام کا مطالعہ کر کے ایک مسودۂ آئین پیش کیا ہے۔ یہ مسودہ اس وقت ایک سب کمیٹی کے پیشِ نظر ہے۔ اس میں ملک صاحب نے کوشش کی ہے کہ جماعت کا آئین ایسا بنایا جائے کہ وہ جمہوری ممالک کی سیاسی پارٹیوں کے ہم پایہ ہو سکے۔ ملک صاحب کی یہ کوشش اس اعتبار سے قابلِ تحسین ہے کہ وہ اپنی پارٹی کو عام جمہوری تصور کے مطابق بنانا چاہتے ہیں۔ اس مسودے کی قابلِ ذکر خصوصیات یہ ہیں۔ اس کے مطابق جماعت کے صدر اور حکومت کے وزیر اعظم کو ایک شخصیت میں مجتمع نہیں کیا گیا۔ جماعت کے صدر کے لئے یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ وہ ایک سال کے بعد بدلے اور زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ یعنی مسلسل دو سال تک صدر رہ سکے۔ صدارت چھوڑنے کے بعد وہ دو سال تک حکومتی عہدوں کا اہل نہیں ہو سکے گا۔ اس تجویز میں یہ فائدہ ہے کہ جماعت حکومتی مناصب حاصل کرنے کا زینہ نہیں بن جائیگی اور صدر کا وقت جماعتی تنظیم پر صرف ہوگا۔ لیکن اس کا یہ نقصان بھی ہو سکتا ہے کہ بہتر افراد اپنی توجہات جماعت پر صرف کرنے کی بجائے حکومتی ایوانوں میں داخل ہونے پر مرکوز کر دینگے۔ مجلس عاملہ کے متعلق یہ تجویز ہے کہ وہ منتخب ہو نہ کہ صدر کی نامزد۔ اس سے یہ فائدہ مترتب ہو سکے گا کہ عاملہ صدر کی جی حضوری نہیں رہے گی اور چونکہ منتخب ہو کر آئیگی اسلئے ارکان جماعت کی نمائندہ ہوگی۔ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ ارکان سازی ہر سال ہو (اب تین سال کے بعد ہوتی ہے) تاکہ ہر سال نئے ارکان جماعت میں داخل ہوتے جائیں اور اسے نئی زندگی دیتے جائیں۔ ایک اہم تجویز یہ بھی ہے کہ انتخابات سے پیشتر ایک کنونشن منعقد ہو جو حکومت کے لئے پروگرام مرتب کرے۔ اس سے پارٹی اور حکومت کے دائرے بھی متعین ہو جائیں گے اور دونوں اپنی جگہوں پر بے خوف کام کر سکیں گی۔

یہ تجاویز اپنی جگہ مستحسن ہیں لیکن کہا نہیں جا سکتا کہ انھیں منظور کر لیا جائیگا اور کس شکل میں۔ پھر آئین کتنا ہی خوش آئند کیوں نہ ہو اس کا نتیجہ تو چلانے والوں کے بس میں ہوتا ہے۔ جیسے چلانے والے ہوں گے ویسے نتائج برآمد ہونگے۔

وحدتِ پاکستان

آئین پاکستان پایۂ تکمیل کو پہنچتا جا رہا ہے۔ بنیادی اصولوں کی رپورٹ امروز و فردا میں مکمل ہو جائے گی اور تسوید آئین کا کام شروع ہو جائے گا۔ ابھی دو اہم معاملات ایسے ہیں جن سے متعلق کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ ایک مسئلہ صوبوں اور مرکز میں تقسیم اختیارات کا ہے اور دوسرا ریاستوں کے خاتمہ و بقا کا۔ صوبوں اور مرکز کا تعلق وفاقی آئین کے مطابق چنداں دشوار نہیں ہونا چاہئے لیکن مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کا جو تنازع پیدا کر دیا گیا ہے اس نے اسے پیچیدہ مسئلہ بنا دیا ہے۔ ہمارے قائدین اسے کیسے حل کرتے ہیں اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ملک کے مستقبل کا دار و مدار اس فیصلہ پر ہوگا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا ریاستوں کو ختم کر دیا جائے یا انھیں باقی رکھا جائے۔ اگر پاکستان کا مفاد سامنے رکھا جائے تو یہ مسئلہ بھی پریشان کن نہیں رہتا، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اربابِ حکومت کی کوئی متعین پالیسی نہیں ہے۔ حال ہی میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ بلوچستانی ریاستوں کو ختم کر کے بلوچستان کو ایک صوبہ بنا دیا جائے۔ اگر بلوچستان میں ایسا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسری جگہوں پر ایسا نہ ہو۔ لیکن معاملہ ابھی تک گومگو میں ہے۔ ایسے مفادات ہیں جو ادغام نہیں چاہتے اور وہ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رہے ہیں کہ ریاستوں کا وجود باقی رہے۔ اسمیں یہانتک غلو کیا جا رہا ہے کہ مثلاً ریاست خیرپور کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اس کا کلچر علیحدہ ہے لہٰذا اسے سندھ میں شامل نہیں کرنا چاہئے۔ اس ریاست کی آبادی بیس لاکھ کے لگ بھگ ہے اور رقبہ ایک تحصیل کے برابر ہے لیکن علیحدگی کے سوال نے اسمیں علیحدہ کلچر تک کا تصور پیدا کر دیا ہے۔ دیکھا جائے تو یہی ایک وجہ ریاستوں کو ختم کر دینے کیلئے کافی ہونی چاہئے کیونکہ اس سے ملک و ملت کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے۔ پاکستان کو زیادہ سے زیادہ متحد ہونے کی ضرورت ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ ریاستیں تو ایک طرف صوبوں تک کا وجود ختم کر دیا جائے اس سے "صوبائیتیں" بھی ختم ہو جائیں گی۔ لیکن کرنیوالوں کا یہ حال ہے کہ انہی دنوں وزیر اعظم نے کہا ہے کہ اگر میرا بس چلے تو میں صوبوں کو ختم کر دوں۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ ملک کے وزیر اعظم کہہ رہے ہیں کہ اگر میرا بس چلے تو۔۔۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ اسقدر بے بس کیوں ہیں؟ اگر صوبوں کا وجود ختم کرنے میں پاکستان کا بھلا ہے تو وہ کیوں اس کیلئے کوئی اقدام نہیں کرتے۔ وہ کچھ کریں تو قوم کو پتہ چل جائیگا کہ کون راہ میں حائل ہے۔ ایک طرف یہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف مجلس دستور ساز میں یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ صوبوں کی حدود میں کمی بیشی کے مجاز گورنر جنرل نہیں بلکہ مجلس دستور ساز ہے۔ یہ فیصلہ درست ہو سکتا ہے لیکن ایسے وقت کیا گیا ہے جبکہ صوبوں کو ختم کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں اور ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر صوبوں کا وجود باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ انہی لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یہ پیچ لگا دی گئی ہے تاکہ صوبوں کا وجود بآسانی ختم نہ ہو سکے۔ اس طریق کار کو مزید پیچیدہ یوں بنا دیا گیا ہے کہ جب کسی صوبے کی حدود میں تبدیلی کا خیال ہو اس کیلئے پہلے متعلقہ صوبے کی رضامندی حاصل کر لینی چاہئے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ کسی صوبے کی حدود میں کمی بیشی ناممکن نہیں تو بہت دشوار ہو جائیگی۔ حالانکہ صوبوں کا وجود و عدم وجود اس بنا پر ہونا چاہئے کہ ان سے ملک کو کیا فائدہ پہنچتا ہے نہ کہ اس بنا پر کہ بعض لوگ اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ حاصل صورت یہ ہے کہ نااہل قیادت نے جمہوریت کا مفہوم غلط سمجھ لیا ہے اور جمہوری اصولوں کو ملکی مفاد کے تابع رکھنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی!

موجودہ قیادت سے اصلاحِ حال کی توقع رکھنا عبث ہے۔ اب تو یہی ہے کہ ملک کا آئین (جیسا کچھ بھی یہ بن رہا ہے) جلد از جلد تکمیل تک پہنچ جائے تاکہ اس کے ماتحت نئے انتخابات ہوں۔ ان انتخابات میں اگر قوم نے ہوش اور سمجھ سے کام لیا تو پاکستان کا کوئی مستقبل ہو سکتا ہے لیکن اگر اس وقت بھی وہی کچھ ہوا جو پہلے انتخابات میں ہوتا چلا آیا ہے تو پھر ـــــ خدا ایں سخت جاں را یار باد!!

مولوی۔صوفی۔اور حدیث

(دوسری تیسری ہجری میں)

"ابنِ اسلام"

"طبقات الکبریٰ" صوفیوں کا تذکرہ ہے جس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے "تذکرہ جامع اولیاء اللہ و صوفیہ کرام از بدو اسلام تا قرن دہم"۔ اور مصنف کا تعارف اس طرح پر ہے "مصر کے مشہور مصنف، محدث فقیہ و فقیر، عالم ربانی، غوث الصمدانی، قطب ربانی امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمہ"۔ یہ تذکرہ دو ضخیم جلدوں میں مکمل ہوا ہے۔ اسوقت میرے پیش نظر پہلے حصے کا اردو ترجمہ مترجمہ مولانا سید عبدالغنی صاحب وارثی اسسٹنٹ اکونٹنٹ جنرل سرکار عالی نظام ہے۔ یہ حصہ پہلی، دوسری اور تیسری صدی ہجری کے صوفیا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ امام شعرانی، امام ابن تیمیہؒ کے ہم عصر ہیں اور تصوف پر ان کی سخت تنقیدوں سے سخت بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ تصوف کا منکر محض متعصب ہے ۔۔۔ جیسا کہ ہم اپنے زمانے میں ابن تیمیہ کا انکار اپنے اور اپنے بھائیوں (صوفیوں) کی نسبت دیکھ رہے ہیں جو عارفین میں سے ہیں۔ بھائیو! جس میں یہ صفت (انکارِ تصوف) پائی جائے اس سے پرہیز کرو اور جس طرح خونخوار درندوں سے بھاگتے ہو اسی طرح اس کی صحبت سے بھاگو"۔

علامہ ابن جوزی میرے نزدیک نہایت سلیم الطبع، دقیقہ رس اور فاش گو بزرگ گزرے ہیں۔ مصنف تذکرہ امام شعرانی نے تصوف کے متعلق ان کی تنقید بھی نقل کی ہے ۔۔۔ "ابن الجوزی نے امام غزالیؒ، بلکہ حضرت جنیدؒ و حضرت شبلی کی نسبت علانیہ لکھا ہے کہ میں بقسم کہتا ہوں کہ ان بزرگوں نے شریعت کو بالکل تہ کرکے رکھدیا ہے۔ اے کاش یہ لوگ صوفی نہ ہوئے ہوتے!"

"طبقات الکبریٰ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشہ ور علما دوسری صدی ہجری ہی میں عام طور پر عالم اسلامی میں پھیل چکے تھے اور مسلمانوں کو حقیقی اسلام سے منحرف کر رہے تھے۔ چنانچہ امام شافعی متوفی ۲۰۴ھ کا قول نقل کیا ہے ۔۔۔ "جو شخص چاہتا ہے کہ اللہ اس پر نور قلب کا دروازہ کھولدے اس کو لازم ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ جن علما کا مقصود دنیا ہے ان کو دشمن سمجھے"۔

شعبہ ابن الحجاج رضی اللہ عنہ روایت و حدیث کے امیر المومنین سمجھے جاتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ ۔۔۔ "خدا کی قسم شیطان مولویوں سے اسی طرح کھیلنے لگا جس طرح بچے اخروٹ سے کھیلتے ہیں"۔

عبداللہ بن المبارک (ولادت ۱۱۸ھ) ان سے کسی نے پوچھا "کمینے لوگ کون ہیں"؟ انھوں نے کہا "جو اپنے دین کو وجہ معاش بناتے ہیں"۔ یہ صحابہ و تابعین کے حالات سننے کو اپنے زمانے کے علما کے پاس بیٹھنے پر ترجیح دیتے تھے۔

محمد بن یوسف اصفہانی متوفی ۱۸۴ھ عالموں، محدثوں اور قاضیوں پر سخت تنقید کرنے کے بعد فرماتے ہیں ۔۔۔ "ہمارے اصحاب خدا ان پر رحمت کرے چلے گئے اور ہم کو اس دنیا کے بیت الخلا میں چھوڑ گئے"۔

فضیل بن عیاض بہت مشہور صوفی بزرگ ہیں ۱۸۰ھ میں رحلت فرمائی۔ فرماتے ہیں ۔۔۔ "جہانتک ہوسکے مولویوں سے دور ہی رہو۔ کیونکہ اگر

یہ تم کو دست رکھیں گے تو تمہاری ایسی تعریف کریں گے جس کے تم لائق نہیں۔ اور اگر تم سے خفا ہونگے تو تمہارے خلاف جھوٹی گواہی دینگے اور وہ مان لی جائیگی۔"

اس زمانے کے ایک بزرگ عالم کو مخاطب کر کے فرمایا:— "اے علما! تم پہلے شہروں کے چراغ تھے جن سے لوگوں کو روشنی پہنچتی تھی۔ مگر اب تم تاریک ہو گئے اور تم پہلے ستارے تھے جن سے لوگ اپنا رستہ معلوم کرتے تھے مگر اب تم کالی گھٹا بن گئے الخ"

ان کا قول ہے کہ:— "خدا کے مولوی منکسر اور رقیق القلب ہوئے ہیں اور دنیا کے مولوی غرور و تکبر والے اور عام لوگوں کو برا سمجھنے والے . . . . غیبت مولویوں کا شیوہ ہے . . . . دنیوی عالم کے ساتھ بیٹھنے سے پرہیز کرو کیونکہ یہ تم کو دنیا کے فریب اور چمک دمک میں پھنسا دے گا۔"

ذوالنون مصری بڑے پائے کے صوفی بزرگ سمجھے جاتے ہیں ۲۴۵ھ میں وفات پائی۔ اپنے زمانے کے علماء سے سخت بیزار رہتے تھے۔ ان کے منہ پر ان کی برائیاں بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تمہارے علم کا مقصد محض حصولِ دنیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ:— "اس زمانے میں عابدوں، زاہدوں اور مولویوں نے گناہ کو معمولی بات سمجھ لیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے پیٹوں اور شرم گاہوں کی خواہشوں میں ڈوب گئے اور اپنے عیبوں کے مشاہدے سے روک دیئے گئے، اور اسلئے وہ ہلاک ہو گئے مگر انھیں خبر نہیں۔ وہ حرام پر جھک گئے اور حلال کی جستجو کو چھوڑ بیٹھے . . . . ان کے دل تو دراصل بھیڑیوں کے سے ہیں مگر انھوں نے اپنے آپ کو انسانی پوشاک کے غلاف میں چھپا رکھا ہے . . . اللہ کی مسجدوں کو . . . . اپنی بیہودہ باتوں اور لڑائی جھگڑوں اور اپنے شور و غل کا اکھاڑا بنا رکھا ہے اور علم کو دنیا کے پھانسنے کا جال بنایا ہے پس ان کی صحبت سے حذر کرو۔"

بشر حافیؒ متوفی ۲۲۷ھ فرماتے ہیں:— "اے بگڑے ہوئے عالمو! تم نبیوں کے وارث ہو . . . . تم نے اپنے علم کو روزی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ کیا تم اس سے بھی نہیں ڈرتے کہ دوزخ کی آگ سب سے پہلے جس چیز سے سلگائی جائیگی وہ تمہیں ہو گے۔"

حاتم اصمؒ متوفی ۲۳۷ھ نے اپنے زمانے کے علماء کے خلاف بہت کچھ کہا ہے نمونتاً ایک قول ملاحظہ فرمائیے:— "اے برے عالمو! تمہاری مثال تو ان جالوں کی ہے جو دنیا میں بچھے گاڑے ہوئے ہیں اور اس کی رغبت کرنے والے ہیں . . . . تم عوام کو بگاڑنے والے ہو الخ"

عاصم انطاکیؒ فرماتے ہیں:— "علما و عباد درندے جانور اور اچک لینے والے بھیڑیئے ہو گئے ہیں . . . . اے بصیرت والو عبرت حاصل کرو۔"

سید الطائفہ جنیدؒ متوفی ۲۹۷ھ فرماتے ہیں:— "جب اللہ مرید کی بھلائی چاہتا ہے تو اس کو صوفیوں کی طرف پہنچاتا ہے اور مولویوں کی صحبت سے روک دیتا ہے۔"

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں "مولویت" ایک بیحد خطرناک وبا کی صورت میں اسی قدیم زمانے میں پھیل چکی تھی اور ذہین لوگ اس کی مضرتوں سے آگاہ ہو کر عوام کو بھی متنبہ کرتے رہتے تھے۔ لیکن عوام کی سادہ لوحی سے جیسے جیسے اس کا رواج بڑھتا گیا، حقیقی اسلام پیچھے ہٹتا گیا یہاں تک کہ بقول حسن بصریؒ "مسلمانی در کتاب" ہو کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف بھی ذریعہ معاش کے طور پر اسی زمانے میں استعمال ہونے لگا تھا۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ ہی کا قول ہے "جب تم صوفی کو اپنے ظاہر کی آراستگی میں مشغول دیکھو تو سمجھ لو کہ اس کا باطن خراب ہے۔"

ابوبکر محمد بن عمر حکیم وراق کہتے ہیں کہ "عالموں میں خرابی آئی تو طاعتیں بگڑیں اور فقیروں میں خرابی آگئی تو اخلاق فاسد ہوئے۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہی کی خرابیاں بڑھتی گئیں۔ اور ان خرابوں ہی کو عوام نے شرعی اور روحانی مقتدا سمجھ لیا۔ اور اگر کہیں کوئی بھلا آدمی پیدا ہوا کہ امت کو ان کی لوٹ کھسوٹ سے بچائے تو ان مقدس سوداگروں نے عوام و حکام کے ہاتھوں اس کو سخت سے سخت ایذائیں پہنچائیں اسکی تفصیل بھی "طبقات الکبریٰ" کے مقدمے میں ملتی ہے۔ اسکے علاوہ تاریخ و سیر کی کتابیں بھی ایسے روح فرسا مظالم سے جو مخلص مصلحین پر ڈھائے گئے بھرپور ہیں۔

یہی دوسری تیسری صدی ہجری کا زمانہ جس میں مولویت اور صوفیت کے پیشے ایجاد ہوئے اسی زمانے میں ایک تیسرا مقدس پیشہ بھی ایجاد ہوا جس کی بنیاد پر غیر قرآنی مذہب اور حاکمیت کا محل تعمیر کیا گیا۔ وہ تھا حدیث سازی کا فن اس پر تقدیس کے ایسے خوش نما غلاف چڑھائے گئے کہ عوام تو عوام بہت سے خواص بھی اس کے مبتلائے فتنہ ہو گئے۔ تاہم ہر زمانے میں ایسے حقیقت شناس بزرگوں کے وجود کا سراغ مل جاتا ہے جنھوں نے حدیث کے خلاف آواز اٹھائی۔ "طلوع اسلام" میں امام ابوحنیفہؒ کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں کہ حدیث کے متعلق ان کی رائے کیا تھی۔ اور اسی بنا پر اصحاب حدیث نے ان کے خلاف زبانِ طعن دراز کی۔ "طبقات الکبری" میں بعض مشہور ائمہ وصوفیہ ایسے ملتے ہیں جو روایات حدیث کی مضرتوں سے آگاہ ہو چکے تھے نمونے کے طور پر چند اقوال یہاں پیش کرتا ہوں۔

امام مالکؒ جو سب سے پہلے جامع مانے جاتے ہیں ان کے اساتذہ کی تعداد نو سو ہے جن میں سے تین سو تابعی تھے۔ ان کا قول ہے کہ "روایتوں کی کثرت سے علم نہیں آتا۔ وہ تو ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ قلب میں اتارتا ہے۔"

فضیل بن عیاض کہتے ہیں "جس نے قرآن کے معنی سمجھے اس کو حدیث لکھنے کی ضرورت نہ رہی" — اب یہ کہا جاتا ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کوئی شے نہیں۔ بلکہ حدیث آگئی تو سب کچھ آگیا۔ قرآن کی الگ ضرورت نہ رہی —— اسحٰق بن ابراہیم نے فضیل سے درخواست کی کہ مجھے کوئی حدیث سنایئے فضیلؒ نے کہا۔ "اگر تو مجھ سے دینار مانگتا تو مجھ پر حدیث کی طلب سے زیادہ آسان تر ہوتا۔ اے غافل جو کچھ تجھے معلوم ہے اگر تو اس پر عمل کرتا تو تجھے حدیث سننے کی فرصت نہ ملتی!" یعنی عمل کرنے والوں کو شغل حدیث کی فرصت ہی نہیں ملنی چاہیے۔

ذوالنون مصری سے کسی نے کہا۔ "آپ حدیث میں کیوں مشغول نہیں ہوتے؟" انھوں نے کہا "حدیث کیلئے اور لوگ ہیں۔ . . . الخ"

ابونصر بشر حافیؒ فرماتے ہیں "جو شخص دنیا میں عزت اور آخرت میں سلامتی چاہے وہ نہ حدیث بیان کرے نہ گواہی دے نہ کسی قوم کا امام بنے اور نہ کسی کا کھانا کھائے"۔ ایک شخص نے ان سے حدیث سنانے کے متعلق اصرار کیا انھوں نے انکار کیا۔ آخر مایوس ہو کر اس نے کہا "اے ابونصر! جب قیامت میں خدا تم سے پوچھیگا کہ تم نے لوگوں کو حدیثیں کیوں نہ سنائیں تو کیا جواب دوگے؟" بشر نے کہا "میں کہونگا اے پروردگار تو نے مجھے نفس کی مخالفت کا حکم دیا تھا۔ برا نفس حدیثیں بیان کرنے اور سردار بن بیٹھنے کو چاہتا تھا اسلئے میں نے اسکی مخالفت کی (اور حدیثیں بیان نہ کیں) اس سے معلوم ہوا کہ لیڈر بننے کیلئے حدیث گوئی کا رواج تھا۔

نضر بن احمدؒ کہتے ہیں کہ تین چیزیں ہر بری آفتیں ہیں۔ بیاہ کرنا۔ حدیثیں لکھنا اور مخالف سے ملنا۔ (یہ جنیدؒ کے ہم عصروں اور مصر کے بڑے بزرگوں میں سے تھے)۔

ابوالعباس احمد بن مسروق متوفی ۲۹۹ھ کہتے ہیں کہ میں نے خواب دیکھا کہ قیامت بپا ہے اور دسترخوان بچھائے گئے ہیں اور میں نے اس پر بیٹھنے کا ارادہ کیا تو مجھے کہا گیا یہ صوفیوں کیلئے ہے میں نے کہا میں بھی صوفیوں میں سے ہوں۔ جواب ملا تو ان میں تھا لیکن حدیث کی کثرت اور مصروں سے متمیز ہونے کی محبت نے تجھے صوفیوں کے ساتھ ملنے سے باز رکھا۔ میں نے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے توبہ کی اور بیدار ہو گیا اور اس قوم (صوفیہ) کے طریق پر توجہ کی اور کہا کہ حدیث کیلئے میرے سوا اور لوگ ہیں:

غور کا مقام ہے کہ اگر یہ لوگ حدیث کو قرآن کی طرح وحی (مثلہ معہ) جانتے تو اس کے متعلق ایسے الفاظ زبان سے نکال سکتے تھے؟ اور سننے والے اسے برداشت کر سکتے تھے؟ — ہمارے جو معاصر شور مچاتے ہیں کہ انکار حدیث کا فتنہ اس زمانہ کی ایجاد ہے۔ گزشتہ ۱۳ صدیوں میں کبھی یہ آواز نہیں آئی۔ ساری امت ہمیشہ حدیث کی دینی اور الہامی حیثیت کی قائل چلی آئی ہے۔ کیا وہ ان سطور پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

اگر بنیاد کمزور ہے تو ۔

..... مکان کبھی پختہ نہیں بن سکتا ۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی قوم صحیح اسلامی کردار کی حامل ہوتو ....

اپنے بچوں کو صحیح اسلامی تعلیم دیجئے ۔

صحیح اسلامی تعلیم کے لئے ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس میں اسلام کی صحیح صحیح تصویر پیش کی گئی ہو ۔

یہ کتاب ہے ۔

اسلامی معاشرت

جسے جناب پرویز نے بچوں عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے خاص طور پر لکھا ہے ۔

اور جسے ادارہ طلوع اسلام نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے ۔

ضخامت ۱۹۲ صفحات ۔ قیمت (مجلد مع گرد پوش) ۲/- روپے ۔

(علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ کراچی ۔

قرآن اور حدیث

دونو دین کے رکن ہیں !

کیا یہ ٹھیک ہے ؟

ٹھیک ہے تو کسطرح - اور غلط ہے تو کیوں ؟

کیا ان دونوں کی حیثیت ایک جیسی ہے ؟

اگر نہیں تو پھر ان کی حیثیت کیا ہے ؟

ان تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب کے لئے -

مقام حدیث

ملاحظہ کیجئے جس میں آپ کو احادیث کے متعلق اتنی معلومات حاصل ہونگی جو کسی اور جگہ یکجا نہیں مل سکینگی -

کتاب دو جلدوں میں مکمل ہوئی ہے - ہر جلد کی ضخامت قریب چارسو صفحات اور قیمت فی جلد (مجلد مع گردپوش) چار روپیہ (علاوہ محصول ڈاک) -

ناظم ادارہ طلوع اسلام - کراچی -

Only Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Rd., Karachi and Text at Adabi Press Robson Road, Karachi Published by Said Ahmed from Tulu-e-Islam Office Karachi